مولوی عبدالحق نصابی سیریز

ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی

کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

مرتب

رشید حسن خاں

ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی

کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی

ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی

کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

مرتب

رشید حسن خاں

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۵۸۹

سنہ اشاعت : ۲۰۰۹ء

اشاعت : دوم

قیمت : ۳۰/=

ڈیزائن سرورق : محمد ساجد

بہ اہتمام : اختر زماں

طباعت : جید پریس، بلیماران، دہلی۔

Dr. Nazeer Ahmed Ki Kahani
Kuchh Meri Aur Kuchh Unki Zabani

Price : [redacted]00

2009

I S B N : 81-7160-039-5

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

Urdu Ghar : 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002

Contact : 23237210, 23236299, Fax : 23239547

E-mail : urduadabndli@bol.net.in : anjuman.urdughar@gmail.com

فہرست

حرفِ آغاز	خلیق انجم	۷
مقدمہ		۹
ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی ـــــ کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی		۲۱
فرہنگ		۷۹

حرفِ آغاز

فارسی اور اُردو تذکروں میں شاعروں کے خاکے اچھّی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں لیکن ان خاکوں میں بہت مختصر الفاظ میں شاعروں کی سیرت وشخصیت کے مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔ ابتدائی تذکروں میں تو یہ خاکے بہت مختصر اور بعض اوقات صرف دو یا تین سطروں ہی پر مشتمل ہیں۔ حکیم قدرت اللہ قاسم کے تذکرے میں خاکے کچھ زیادہ بڑے ہو گئے ہیں اور محمد حسین آزاد کی کتاب "آبِ حیات" پہلا تذکرہ ہے، جس میں بعض اہم شاعروں کی شخصیت کی مکمل مرقع نگاری کی گئی ہے اور مختلف پہلوؤں کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ پوری شخصیت ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

خاکہ نگاری کو باقاعدہ فن کے طور پر غالباً مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنایا۔ اُنھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کا جو خاکہ لکھا ہے، وہ اُردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اُردو کا پہلا طویل اور مکمل خاکہ ہے اور سیکڑوں صفحات پر مشتمل سوانح سے زیادہ بھاری ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ڈاکٹر نذیر احمد کے شاگرد رہے تھے، اس لیے اُنھیں ڈاکٹر صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ایک سچّے اور کھرے انسان اور ادیب تھے، اسی لیے اُنھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں، دونوں کو ایمان داری کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ مرزا فرحت اللہ نے خرابیاں بڑے ادب و احترام کے ساتھ اور ہمدردانہ انداز میں بیان کی ہیں۔ ہمارے کچھ خاکہ نگاروں نے شخصیتوں کو طنز و مزاح کا ذریعہ بنا رکھا ہے، یعنی وہ شخصیت کے کمزور پہلوؤں پر اِس طرح مبالغہ آرائی کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں کہ اس میں تضحیک کا پہلو نکلتا ہے اور پڑھنے والا ہنسے بغیر نہیں رہتا۔ اِس کے برعکس فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی شخصیت کے کمزور

پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ ڈاکٹر صاحب پر ہنسی نہیں آتی بلکہ ہمیں اُن سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

"ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی — کچھ اُن کی اور کچھ میری زبانی" کا شمار اُردو کے اعلاترین خاکوں ہی میں نہیں اُردو کی بہترین تحریروں میں بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے چالیس پینتالیس سال سے یہ خاکہ یا اِس کے اقتباسات اسکولوں اور کالجوں کے مختلف نصابات میں شامل ہوتے آرہے ہیں۔ متنی تنقید کا بنیادی اُصول یہ ہے کہ بغیر مرتّب کیے ہوئے جو تحریر جتنی بار چھپے گی، اُتنی ہی زیادہ اس میں غلطیاں ہوں گی۔ یہی حال اس خاکہ کا بھی ہوا۔ کبھی کسی متنی نقاد نے اِس کا تنقیدی اڈیشن تیار نہیں کیا۔ نصابی ضرورتوں کے لیے پبلشر بار بار اِسے کتابی صورت میں شائع کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اِس میں بے شمار غلطیاں دَر آئی ہیں۔ انجمن کی ادبی کمیٹی نے رشید حسن خاں صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس طرح کی تمام کتابوں کو جو مختلف سطحوں کے نصاب میں شامل ہیں اور بار بار چھپنے کی وجہ سے اُن کے متن میں ترمیم واضافے اور حذف ہو گئے ہیں، مرتّب کر دیں تاکہ انجمن اِنھیں شائع کر سکے۔ مجھے دلی مسرت ہے کہ رشید حسن خاں صاحب نے ہماری درخواست قبول کر کے یہ کام شروع کر دیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ خاں صاحب کا شمار اُردو کے اُن چند متنی نقادوں میں ہوتا ہے، جن کے تیار کیے ہوئے تنقیدی اڈیشن مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے "فسانۂ عجائب" اور "باغ و بہار" کے جو تنقیدی اڈیشن مرتّب کیے ہیں، وہ متنی تنقید کا بہترین اور قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنے میں خاں صاحب نے اپنی روایت قائم رکھتے ہوئے اِسے بڑی جانفشانی اور دیدہ ریزی سے مرتّب کیا ہے۔ کتاب کی ایسی جامع فرہنگ تیار کی ہے جو اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لیے بہت مفید ہے۔

خلیق انجم

مقدّمہ

مولوی نذیر احمد اُردو کے بہت مشہور مصنّف ہیں۔ اُن کی کتابوں مرآۃُ العُرُوس، تَوبَۃُ النَّصُوح اور اِبنُ الوَقت نے بہت شہرت پائی اور یہ مختلف درجوں کے نصاب میں شامل رہی ہیں۔ اِن کتابوں کو پڑھ کر مولوی صاحب کی کئی خوبیاں اور خصوصیتیں ہم کو معلوم ہو جاتی ہیں۔ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی کے عالم تھے، مگر اُردو کے مزاج شناس تھے اور بامحاورہ زبان لکھنے کا ڈھنگ اُن کو آتا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سماجی اور اخلاقی بُرائیوں کے بہت خلاف تھے۔ جاہلانہ رسمیں جو گھروں میں رواج پاگئی تھیں اور اخلاقی خرابیاں جو مُسلم معاشرے میں شامل ہو گئی تھیں، وہ اُن کو کُھل کر بُرا کہتے تھے۔ غدر کے بعد مسلم معاشرہ زوال کا بے طرح شکار ہو گیا تھا۔ ایک طرف ہمتیں ٹوٹنے لگی تھیں اور دوسری طرف مغربی تہذیب کا اثر بڑھ رہا تھا اور ذہنوں پر بُرا اثر ڈال رہا تھا۔ مغربی تہذیب سے اچھے عناصر کو منتخب کرنے اور اُن کو جذب کرنے کے بجائے، مغربی تہذیب کی ظاہری تقلید اِس طرح کی جانے لگی تھی جو ہماری تہذیبی قدروں سے میل نہیں کھاتی تھی۔ مغربی تہذیب میں سائنس اور ٹکنالوجی کا جو حصّہ تھا اور حقیقت پسندی کی جو طاقت تھی، اُس کو منتخب کرنے کے بجائے، ظاہری دِکھاوے اور اوپری چمک دمک کو سب کچھ سمجھ لیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کی کتابیں توبۃ النصوح اور ابنُ الوقت اسی موضوع پر ہیں۔ ان میں جو مرکزی کردار ہیں، وہ اُس زمانے کے اُن نوجوانوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے بجائے، مغربی تہذیب کی بعض ظاہری چیزوں کی نقل کرنے کو سب کچھ سمجھتے تھے۔

لیکن اِس سے بھی بڑھ کر خرابی یہ تھی کہ مسلمان عورتیں جدید تعلیم سے محروم تھیں اور اُس کے نتیجے میں نئے خیالات سے بھی اُن کے ذہن خالی تھے۔ طرح طرح کے وہم دلوں

میں اپنی جگہ بنائے ہوئے تھے اور عجیب عجیب رسمیں گھروں میں پناہ گزیں تھیں۔ مولوی صاحب کی کتاب مرآۃ العروس کا موضوع یہی ہے۔ قصے کے پردے میں عورتوں کی تعلیم کی ضرورت اور فضول رسموں اور جاہلانہ وہموں کو دلوں اور گھروں سے نکالنے کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ مولوی صاحب کا پُر لطف اندازِ بیان قصے پن کو برقرار رکھتا ہے اور دل چسپی کو کم نہیں ہونے دیتا۔

جب کوئی قوم زوال کے اثرات کا شکار ہو جاتی ہے تو اور خرابیوں کے علاوہ، ایک بہت بڑی خرابی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ آدمی صنعت و تجارت کو کم رُتبہ کام سمجھتا ہے، محنت و مشقت سے جی چُراتا ہے اور ساری توجہ اِس پر لگی رہتی ہے کہ سرکاری نوکری مل جائے، وہ چپراسی کی ہو یا کلرک کی۔ باپ دادا کا نام لے کر خاندانی بڑائی کا بکھان کیا جاتا ہے اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ خود کہنے والے کا احوال کیا ہے، اُس میں کیا صلاحیت ہے اور کیا خوبیاں ہیں۔ مولوی صاحب ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، مگر اُنھوں نے محنت کر کے اور دل لگا کر تعلیم حاصل کی۔ خود سرکاری نوکر رہے، مگر ہمیشہ یہ چاہتے رہے کہ عام مسلمان، خاص کر نوجوان صنعت اور تجارت میں دل لگائیں، اس کے لیے وہ ہمیشہ مالی مدد دینے کے لیے تیار رہا کرتے تھے۔ اِسی کتاب میں ایک جگہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اُن کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ کالج میں لاٹ پادری صاحب آتے اور اُنھوں نے لکچر میں سارا زور اِس پر دیا کہ ہندستانیوں کو یورپ والوں کی طرح سچ بولنا سیکھنا چاہیے۔ مولوی صاحب اُس جلسے میں موجود تھے۔ سنتے رہے اور کُڑھتے رہے۔ آخر میں جب مولوی صاحب شکریہ ادا کرنے کھڑے ہوئے تو صرف شکریہ ادا کرنے یا لاٹ صاحب کی تعریف کرنے کے بجائے، اُنھوں نے یہ کہا کہ لاٹ صاحب نے یورپ والوں کی طرح سچ بولنے کا تو مشورہ دیا ہے، لیکن یہ نہیں کہا کہ ہندستان والوں کو صنعت اور تجارت میں حصّہ لینا چاہیے؛ خرابیاں اِسی سے دور ہوں گی اور قومی خوش حالی اِسی طرح آسکے گی۔ اُس زمانے میں کسی انگریز کے منھ پر اِس طرح سچّی بات کہہ دینا اور اُس پر اعتراض کرنا بہت مشکل تھا۔

اِس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولوی صاحب کے ذہن میں نئے خیالات کس طرح

بیٹھے ہوئے تھے اور وہ قومی ترقّی کے لیے تعلیم، صنعت و حرفت اور تجارت کو کس قدر ضروری سمجھتے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ آدمی کو اپنی ہمّت اور صلاحیت کے بل پر ترقّی کرنا چاہیے؛ خاندان والوں کا جا و بے جا حوالہ دینا اور خود نکمّے ہونے کے باوجود، باپ دادا کے نام پر فخر کرنا شرم کی بات ہے۔ اسی کتاب میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایک جگہ اُن کی زبان سے اُن کے خیالات کو اِس طرح بیان کیا ہے: "جب کبھی اِس پہلو پر نصیحت کرتے تو ہمیشہ یہی فرماتے کہ بیٹا! جو کچھ کرنا ہے، خود کرو؛ باپ دادا کی ہڈیوں کے واسطے سے بھیک نہ مانگتے پھرو۔" اسی سلسلے میں آگے چل کر مولوی صاحب کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: "اُن کو اپنی ابتدائی غربت پر ناز تھا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ میاں! اگر لفٹننٹ گورنر کے بیٹے ہو، تو کم سے کم ڈپٹی کمشنر تو ہو جاؤ۔ دس روپے کے اہل کار ہو کر، باپ کو لفٹننٹ گورنر کہتے تمھیں شرم نہیں آتی!"۔

وہ عورتوں کی تعلیم کے حامی تھے اور رسم و رواج کی خرابیوں کو سماج کے لیے بہت زیادہ تباہی پھیلانے والی چیز سمجھتے تھے۔ اصل میں یہ سر سیّد احمد خاں کا اثر تھا، وہ سر سیّد کے خاص آدمیوں میں سے تھے۔ سر سیّد نے مسلم معاشرے کی خرابیوں کو خوب سمجھ لیا تھا اور آنے والے زمانے کے مسائل کا اُن کو خوب اندازہ تھا۔ ہاں دونوں میں ایک یہ فرق ضرور تھا کہ سر سیّد جس قدر انگریزوں سے قریب تھے اور انگریزی خیالات کو جس قدر اہمیت دیتے تھے، مولوی نذیر احمد انگریزوں کی کچھ خوبیوں کے قائل ہونے کے باوجود ذہنی طور پر اُن سے اِس قدر قریب نہیں تھے۔ وہ مغربی تہذیب سے مرعوب نہیں تھے، ہاں مغربی تعلیم اور مغرب کی سائنسی ایجادات کے قائل تھے اور اُن سے متاثّر تھے۔

مولوی صاحب کی اِن کتابوں سے اور اُن کی ایسی دوسری تحریروں سے ہم کو یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی تبدیلیوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اُن کے سوچنے کا ڈھنگ اور اُن کا نقطۂ نظر کیا تھا، اُن کی تحریروں سے اُن کے لکھنے کا انداز بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے؛ اِن سب باتوں کے باوجود ہم کو یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ مولوی صاحب کی شخصیت کیسی تھی۔ انسانی سطح پر اور شخصی سطح پر اُن میں کیا خوبیاں تھیں اور کیا کمزوریاں

تھیں۔ بات یہ ہے کہ تحریر، لکھنے والے کا صرف ایک رُخ ہمارے سامنے پیش کیا کرتی ہے۔ ہم اُس کے اندازِ فکر سے تو واقف ہو سکتے ہیں، لیکن خود اُس سے، اُس کی بھرپور شخصیت سے، اُس کی شب و روز کی مصروفیتوں سے اور پسند و ناپسند سے واقف نہیں ہو پاتے۔ کتاب میں مصنف ہمارے سامنے آتا ہے، شخص ہمارے سامنے نہیں آپاتا۔ مولوی صاحب کی کتابوں میں ایک زبردست عالم اور اُردو کے ایک بڑے انشاپرداز سے ہماری ملاقات ضرور ہوتی ہے، لیکن نذیر احمد جو ایک شخص تھے، جو انسان تھے اور انسانوں کی طرح جن کی زندگی میں بہت سے پہلو تھے؛ اُن کو ہم نہیں دیکھ پاتے۔ اپنی تحریروں میں وہ عمامہ باندھے، جُبّہ پہنے ایک باوقار عالم اور اعلا درجے کے خطیب کی حیثیت سے اسٹیج پر کھڑے ہوئے تقریر کرتے اور خطابت کے جوہر دکھاتے نظر آتے ہیں۔ اُن نذیر احمد سے ہماری ملاقات نہیں ہو پاتی جو پھبتی کسنے اور جملے چُست کرنے میں بھی کمال رکھتے تھے۔ نہایت درجہ خوش مذاق تھے، یہاں تک کہ بہت متین اور بہت سنجیدہ طالب علموں کو "مُسمسے" اور "مُقطَّع" کہہ کر اپنی بیزاری کا اظہار بھی کر دیتے تھے۔ اِن نذیر احمد صاحب سے صحیح معنوں میں ہمارا تعارف ہوتا ہے مرزا فرحت اللہ بیگ کے اُس خاکے میں جسے آپ پڑھیں گے۔

ہمارا قومی مزاج کچھ اِس طرح کا بن گیا ہے کہ ہم جس شخص کو ہیرو بنا لیتے ہیں، پھر اُس کو انسان نہیں رہنے دیتے۔ اُس کو ہر طرح کی اچھائیوں کا مجموعہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، خواہ اِس کوشش میں اُس کی اصلی شخصیت بدل ہی کیوں نہ جائے۔ انسان کو فرشتہ بنا دینا' درحقیقت اُس کے ساتھ انتہا درجے کی بے انصافی کرنا ہے۔ انسان کا درجہ تو فرشتوں سے بڑا ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی بڑا انشاپرداز، عالم، مُصلحِ قوم یا سیاسی رہ نما ہو، بنیادی طور پر تو وہ انسان ہے اور انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جس چیز کو "بشریت" کہتے ہیں، اُس کا مطلب یہی ہے۔ ہمارے معاشرے میں جن لوگوں کا بڑا نام اور بڑا کام ہے، وہ سب انسان تھے۔ اُن میں خوبیاں بھی تھیں اور کمزوریاں بھی اور یہ عین تقاضاے بشریت ہے۔ جس طرح ہم کو اِس کا حق حاصل نہیں کہ ہم کسی شخص کی اصلی اور واقعی خوبیوں کو، اُس کے کمالات کو اور اُس کے کارناموں کو گھٹا کر یا بگاڑ کر پیش کریں؛ اِسی طرح ہم کو اِس کا بھی

حق حاصل نہیں کہ اُس کی کم زوریوں کی اِس طرح پردہ پوشی کی جائے جیسے وہ اِس دنیا کا رہنے والا تھا ہی نہیں، کسی اور سیّارے کی مخلوق تھا۔ صورت کو بگاڑنے کے علاوہ، اِس کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوتا ہے تحقیق کا عمل اپنی حیثیت کھو دیتا ہے۔ اِس سلسلے میں مرزا غالبؔ کا یہ شعر ضرور ہمارے سامنے رہنا چاہیے:

خواہش کو، احمقوں نے پرستش دیا قرار　　کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں!

"خواہش" اور "پرستش" میں جو فرق ہے، وہ ہمیشہ ذہن میں رہنا چاہیے۔ مرزا فرحت اللّٰہ بیگ، مولوی نذیر احمد مرحوم کے عزیز شاگرد تھے، کم و بیش دو سال تک وہ اُن سے پڑھتے رہے تھے؛ اِس مدّت میں اُنھوں نے مولوی صاحب کو خوب دیکھا اور سمجھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اِس خاکے میں مولوی صاحب کی تصویر نظر نہیں آتی، بل کہ وہ خود قدِ آدم صورت میں چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، لین دین کرتے اور ایک نارمل انسان کی طرح جیتے جاگتے دکھائی دیتے ہیں۔

اُردو میں اچھے اچھے خاکے لکھے گئے ہیں؛ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ فرحت اللّٰہ بیگ کے اِس خاکے کو جس قدر شہرت ملی ہے، وہ شاید ہی دوسروں کے حصّے میں آئی ہو۔ وجہ اِس کی یہ ہے کہ عام طور پر جو خاکے لکھے گئے ہیں، یا لکھے جاتے ہیں؛ وہ یا تو یک طرفہ ہوتے ہیں، یعنی زندگی کا بس ایک رُخ سامنے آپاتا ہے، یا پھر صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ خاکہ لکھنے والا کوشش کر کے ایسے پہلو سامنے لانا چاہتا ہے جن سے ایک خاص طرح کی شخصیت کا نقش ابھر کر سامنے آئے۔ اِسی کے ساتھ اِس کوشش کا بھی جگہ جگہ احساس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے بعض مقامات پر خواہ مخواہ مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، یا ایسے رُخ ابھارے ہیں جو ظرافت کی روشنی میں نہائے ہوئے ہیں۔ جہاں یہ احساس پڑھنے والے کے دل میں پیدا ہوا کہ لکھنے والے نے کوشش کر کے مزاح یا ظرافت یا طنز کو چمکانے کی کوشش کی ہے، وہیں اُس تحریر کا اثر کم ہونے لگتا ہے۔

مرزا صاحب کا لکھا ہوا یہ خاکہ، صرف خاکہ نہیں، اِسے "سوانحی خاکہ" کہنا چاہیے؛ یعنی

اس سے مولوی صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلو ہی سامنے نہیں آتے ۔ اُن کی زندگی کی بہت سی تفصیلات بھی ہمیں معلوم ہو جاتی ہیں ۔ ایک اچھے لکھنے والے کی طرح مرزا صاحب نے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ زندگی کی بس وہی تفصیلات اس تحریر میں آنے پائیں ، جن سے خاکہ نگاری کا دائرہ ٹوٹنے نہ پائے ۔ یہ نہ ہو کہ خاکہ ، سوانح عُمری میں تبدیل ہو جائے اور حالاتِ زندگی کا بہی کھاتا بن کر رہ جائے ۔

ایک اور خوبی اس خاکے کی یہ ہے کہ مرزا صاحب کسی منظر کو غیر معمولی نہیں بناتے ، مگر اُن کی تحریر کا انداز اور بات کہنے کا ڈھنگ کچھ ایسا سادہ و پُر کار ہے کہ منظر خود بہ خود غیر معمولی بن جاتا ہے ۔ اس غیر معمولی پن میں ہلکی سی مزاح کی چاشنی ضرور شامل رہتی ہے ؛ بل کہ یوں کہیے کہ تہ نشیں رہتی ہے ، جس کے اثر سے دل چسپی اور دل کشی کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں اور پڑھنے والا نہ اوبھتا ہے نہ اکتاتا ہے ؛ اس کے برخلاف دل میں ہمہ وقت یہ اشتیاق کار فرما رہتا ہے کہ اب مرزا صاحب کیا کہیں گے اور مولوی صاحب اُس کا کیا جواب دیں گے یا یہ کہ اس کے بعد مولوی صاحب کیا کریں گے ! مثال کے طور پر آپ ایک بار پھر اُس منظر پر نظر ڈالیے جہاں سرحد کے طالبِ علم مولوی صاحب سے مقاماتِ حریری کا سبق پڑھ رہے ہیں ۔ آپ دیکھیں گے کہ مرزا صاحب نے اپنی طرف سے کوئی ایسا جملہ نہیں لکھا ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ مزاح پیدا کرنا چاہتے ہیں ، یا یہ کہ اس منظر کو غیر معمولی بنانا چاہتے ہیں ۔ اُنھوں نے واقعات کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ مزاح خود بہ خود اُبھر آتا ہے اور پڑھنے والا ایک خاص طرح کی شگفتگی محسوس کرنے لگتا ہے اور جب رات کے مٹکے میں سفر کرنے کا جملہ سامنے آتا ہے ، تو شگفتگی کا وہ احساس بے ساختہ ہنسی میں بدل جاتا ہے ۔

اگر مرزا صاحب یہ خاکہ نہ لکھتے تو ہم سب کو یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ مولوی نذیر احمد مرحوم کس قدر خوش ذوق اور " ہنسوڑ " تھے ۔ ہم اُنھیں نرا مولوی سمجھتے رہتے اور یہ اُن کی بڑی حق تلفی ہوتی ۔ آپ ذرا اُس واقعے کو پھر سے پڑھیے ، جس میں ہندو کالج کے ایک طالبِ علم ، مولوی صاحب کے پاس پڑھنے آتے ہیں ۔ سبق پڑھنا شروع کرتے ہیں تو اشعار

کو اِس طرح پڑھتے ہیں کہ نظم اور نثر کا فرق مٹ جاتا ہے۔ مولوی صاحب بجائے ڈانٹنے ڈپٹنے کے، اُن کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ کل سے کالی جان (طوائف) کے یہاں تعلیم میں ہو آیا کرو، تمھارے کانوں کو نظم اور نثر کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ یہ خوش مذاقی، شگفتہ خیالی اور شگفتہ بیانی کا یہ انداز، اگر مرزا صاحب کا لکھا ہوا یہ خاکہ ہمارے سامنے نہ ہوتا، تو کیا ہم اِس انداز سے واقف ہو سکتے تھے؟ (آج کل کے بہت سے اساتذہ اور طَلَبہ کے شعر پڑھنے کو اگر مولوی صاحب سنتے تو معلوم نہیں کیا کہتے!)

مرزا فرحت اللہ بیگ دلّی والے تھے، یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ اہلِ زبان تھے: لیکن آپ اُن کی عبارت میں نہ محاوروں کی بھرمار پائیں گے اور نہ جا و بے جا ضرب الامثال کے جوڑ پیوند دیکھیں گے۔ مرزا صاحب نے اپنے ایک اور مضمون میں اِس سلسلے میں بہت دل چسپ انداز سے اِس طرف توجہ دلائی ہے کہ زبان میں مشکل لفظ لانا کچھ اچھی بات نہیں، لکھتے ہیں:

"خدا معلوم ہمارے یہاں کے مولویوں کی یہ کیا ذہنیت ہے کہ جب باتیں کریں گے تو ضرورت بے ضرورت عربی کے موٹے موٹے الفاظ ٹھونس دیں گے۔ لکھنے بیٹھیں گے تو بے چاری اردو کو عربی کا وہ جامہ پہنائیں گے کہ اُس کو سمجھنے کے لیے ہر ایک سطر میں ایک دو دفعہ قاموس دیکھنے کی نوبت آئے۔ بچّوں کا نام رکھیں گے تو ایسا کہ نوکر چاکر تو کیا، خاصے پڑھے لکھوں کی زبان سے اُس کا ادا ہونا مشکل ہو۔ اِس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، بس یہی ناکہ کام نکالنے کے لیے گھر والے نام کو بگاڑ لیتے ہیں۔ چناں چہ دیکھیے مولوی مملوک العلی صاحب کا نام بگڑ کر "ملّومیاں" ہوا اور اُن کے صاحبزادے صبغتُ العلی صاحب کے نام نے "گتّومیاں" کی شکل اختیار کی۔"

اِس خاکے میں بھی ایک جگہ اُنھوں نے مولوی نذیر احمد صاحب کے لکھنے کے انداز پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ مولوی صاحب اپنی نثر میں محاورے کچھ زیادہ استعمال کرتے تھے، جس سے عبارت بوجھل ہو جاتی تھی اور روانی کم ہو جاتی تھی۔ اِس سلسلے

میں لکھا ہے :

"میں اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا... اُن کی عبارت کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ ملنا مشکل ہے، مگر چلتے چلتے راستے میں عربی الفاظ کے رُوڑے ہی نہیں بچھاتے تھے، پہاڑ رکھ دیتے تھے۔ غرض یہ تھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ میں دہلی والا ہی نہیں، مولوی بھی ہوں۔"

اِس سے ذرا پہلے یہی بات اِس انداز سے لکھی ہے :

"محاوروں کی بھرمار کے متعلق اکثر مجھ سے اُن کا جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ میں ہمیشہ کہتا تھا کہ جنابِ والا! اہلِ زبان کو یہ دکھانے کی ضرورت نہیں کہ وہ محاوروں پر حاوی ہے۔ یہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم باہر والے نہیں، دہلی والے ہیں۔"

فرحت اللہ بیگ کی نثر کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ محاوروں سے زیادہ بل کہ یوں کہیے کہ بنیادی طور پر روز مرّہ کو نظر میں رکھتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ اُن کی عبارت میں سادگی اور روانی، اِن دونوں کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ محاوروں سے بھری ہوئی زبان لکھنا کچھ بہت مشکل بات نہیں، مگر اہلِ زبان جس طرح بولتے ہیں اور جسے روز مرّہ کہتے ہیں، اُس انداز کو برقرار رکھنا واقعی مشکل ہے۔ خود ہمارے زمانے میں بعض لوگ ایسے ہیں جو ادبدا کے محاوروں کے جوڑ پیوند اپنی عبارت میں لگاتے چلے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اہلِ زبان ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں، حالاں کہ یہ زبان سراسر مصنوعی ہوتی ہے۔ محاورہ بہت کام کی چیز ہے۔ اِس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ لمبے چوڑے مفہوم کو چند لفظوں میں ادا کر دیتا ہے؛ لیکن عبارت میں اِس کا استعمال صحیح معنوں میں دیدہ وری اور مشّاقی کا طلب گار ہوتا ہے۔ اچھّے لکھنے والے کو یہ بات خوب معلوم ہوتی ہے کہ کہاں پر محاورہ کھپ سکتا ہے اور اپنی معنویّت کو روشن کر سکتا ہے اور نو سکھیے، جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ شہرت کے طلب گار ہوتے ہیں، وہ محاوروں کی بھرمار

سے عبارت کو بے لطف بنا دیتے ہیں اور اپنے اناڑی پن کا راز فاش کر دیتے ہیں۔
ہمارے یہاں کئی مزاح نگار ایسے ہیں (جیسے شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی وغیرہ) جن کے متعلق مختلف لوگوں نے الگ الگ انداز سے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ فلاں مزاح نگار الفاظ سے مزاح پیدا کرتا ہے اور فلاں واقعات کی ترتیب سے اُسے ابھارتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُن کے یہاں یہ دوئی مٹ گئی ہے۔ بیان کا اُسلوب اور واقعات کی ترتیب، یہ اُن کے یہاں یک جان نظر آتے ہیں۔ اُن کی عبارت پڑھ کر یہ احساس پیدا ہی نہیں ہوتا کہ کس مقام پر لفظوں کا کھیل ہے اور کہاں واقعات کے انوکھے پن نے مزاح کی تشکیل کی ہے اور یہ بڑا کمال ہے اور اس میں اُن کے شریک کم سے کم لوگ نکلیں گے۔
عبارت کو اس طرح بنانا سنوارنا کہ وہ بے جا عبارت آرائی اور ناروا آرائش پسندی کے دائرے میں داخل ہو جائے، مرزا صاحب کی تحریر ان خامیوں سے پاک نظر آتی ہے؛ مگر اس سلسلے میں ایک خاص بات ضرور ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ آدمی دن بھر میں جتنی باتیں کرتا ہے، وہ سب درجِ رجسٹر ہونے کے قابل نہیں ہوتیں۔ اسی طرح آدمی عمر بھر جو کچھ لکھتا رہتا ہے، وہ سب، عام طور پر ایک درجے اور ایک سطح کا نہیں ہوتا، ہو بھی نہیں سکتا۔ مرزا صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اُن کے مضامین ہی سات حصوں میں چھپے ہیں۔ باقی تحریریں اس کے علاوہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کے لکھے ہوئے دو خاکے "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی" اور "ایک وصیت کی تعمیل" (مولوی وحید الدین سلیم سے متعلق خاکہ نما مضمون ہے)"١٢٦١ھ میں دلی کا ایک مشاعرہ"، "پھول والوں کی سیر"، یہ چار تحریریں درجۂ اوّل کی ہیں۔ اگر الفاظ کو سختی کے ساتھ بالکل صحیح معنوں میں استعمال کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی" صحیح معنی میں خاکہ (یا سوانحی خاکہ) ہے اور اعلا درجے کا ہے۔ شاید ہی کسی دوسرے اچھے خاکے کو اس کے مقابل رکھا جا سکے۔
"ایک وصیت کی تعمیل" میں خاکہ نگاری اور مضمون نگاری، دونوں کے عناصر یک جا ہو گئے ہیں، یوں وہ اس پہلے خاکے کے برابر کا نہیں۔ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا؛ اس لیے کہ

مولوی وحید الدّین سلیم کو اُنھوں نے دور سے دیکھا تھا اور مولوی نذیر احمد کو قریب سے دیکھا تھا اور بہت قریب سے۔ پھر ایک بات اور بھی ہے۔ ہر اچھّے خاکہ نگار اور مرقع نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمدردی کا تھوڑا بہت تاثر اُس کے ذہن اور دل میں ضرور جاگزیں ہو۔ اِسے آپ موانست یا دلی تعلق سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اِس کے بغیر حقیقت نگاری کا حق تو ادا ہو سکتا ہے، مگر یہ محسوس نہیں ہوگا کہ خاکے میں جان پڑ گئی ہے اور مرقع سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مولوی نذیر احمد سے جو تعلقِ خاطر اور دلی موانست مرزا صاحب کو تھی، اُس نے درحقیقت اِس خاکے میں روح دوڑا دی ہے۔ وحید الدّین سلیم سے اُنھیں نہ یہ تعلقِ خاطر تھا اور نہ ویسی دلی موانست۔ ہاں "پھول والوں کی سیر" میں یہ دونوں عناصر روح بن کر دوڑ رہے ہیں، جنھوں نے اِسے دہلی کی تہذیب کے ایک خاص رُخ کا جیتا جاگتا ترجمان بنا دیا ہے۔ اُن کا دلّی والا ہونا، پُرانی تہذیبی قدروں سے دلی تعلق رکھنا اور دہلی کی ٹوٹتی ہوئی اور بدلتی ہوئی تہذیبی زندگی سے بہت زیادہ متاثر ہونا؛ ان عناصر نے اِس تہذیبی مرقعے میں زندگی کا خون دوڑا دیا ہے اور اِسے جیتے جاگتے منظر میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہی احوال دہلی کے ایک مشاعرے کا ہے کہ وہ بھی دراصل دہلی کی مٹتی ہوئی یا یوں کہیے مرحوم تہذیبی زندگی کا مرقّع ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا مکان پُرانی دہلی کے محلّے چوڑی والان میں تھا۔ وہ ۱۸۸۳ء میں ستمبر کے مہینے میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں ہندو کالج میں داخلہ لیا تھا، جہاں سے ۱۹۰۲ء میں انٹرمیڈیٹ (ایف۔ اے) کا امتحان پاس کیا تھا۔ (یہ کالج اُس زمانے میں کناری بازار کے ایک چھوٹے سے مکان میں تھا)۔ اُس کے بعد اُنھوں نے سینٹ اسٹیفنز کالج میں داخلہ لیا، جہاں سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ گھریلو حالات کی وجہ سے وہ خواہش کے باوجود ایم۔ اے میں کام یابی حاصل نہ کر سکے۔ ۱۹۰۷ء میں وہ دہلی سے حیدر آباد چلے گئے، جہاں ملازمت کے سلسلے میں آخرِ عمر تک رہے۔ ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو انتقال ہوا اور حیدر آباد ہی میں دفن کیے گئے۔ اِس حساب سے اُنھوں نے اپنی عُمر کے شروع کے تقریباً ۲۴ سال دہلی میں گزارے اور پھر

باقی ساری عمر حیدر آباد میں گزار دی۔

اِس خاکے میں جگہ جگہ دانی کا نام آیا ہے، اِس سے مراد ہیں مشہور ماہر آثارِ قدیمہ غلام یزدانی، جو مرزا کے بچپنے کے دوست اور ہم جماعت تھے۔ دونوں کے گھر بھی آمنے سامنے تھے۔ مرزا صاحب کے انتقال کے بعد اِنھی غلام یزدانی نے یادگارِ فرحت کے نام سے مرزا صاحب کے حالات اور اُن کے ادبی کارناموں سے متعلق ایک کتاب مرتب کی تھی، جو حیدر آباد سے ۱۹۵۱ء میں "فرحت میموریل کمیٹی" کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ میں نے اوپر جو تاریخیں لکھی ہیں، وہ اِسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

"ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی" یہ خاکہ سب سے پہلے انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے رسالے اردو کے شمارۂ جولائی ۱۹۲۷ء میں (ساتویں جلد، ص ۳۸۲ سے ۴۴۰ تک) چھپا تھا۔ ایم۔ حبیب خاں صاحب نے از راہِ لطف انجمن کی لائبریری سے اِن صفحات کا عکس فراہم کیا۔ مضامینِ فرحت (اشاعتِ اوّل) کے پہلے حصّے میں بھی یہ مضمون شامل ہے۔ یہ کتاب بھی انجمن کی لائبریری میں محفوظ ہے اور حبیب خاں صاحب کی عنایت سے وہیں سے مجھے ملی۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہ وہی نسخہ ہے جسے مرزا فرحت اللہ بیگ نے مولوی عبد الحق مرحوم کو دیا تھا۔ اِس پر مولوی عبد الحق کا نام اور نیچے مرزا فرحت اللہ بیگ کے دستخط موجود ہیں اور اِس لحاظ سے یہ منفرد نسخہ ہے۔ مولوی نذیر احمد کا یہ خاکہ دراصل لکھا ہی گیا تھا مولوی عبد الحق کی فرمایش اور اصرار پر۔ غالباً یہ پہلا مضمون ہے جو فرحت اللہ بیگ کے نام سے شائع ہوا تھا، ورنہ اِس سے پہلے وہ عموماً "مرزا الم نشرح" کے نام سے لکھا کرتے تھے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ میں نے جب رسالۂ اردو اور مضامینِ فرحت میں شامل اِس مضمون کا مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ مجموعے میں شامل کرنے کے لیے مرزا صاحب نے اِس پر نظرِ ثانی کی تھی، یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ لفظ اور جملے بدلے ہوئے ملتے ہیں۔ (ہاں ایک یہ بات بھی ہے کہ کتابت کی غلطیاں اِس مجموعے میں خاصی تعداد میں ہیں)۔ میں نے مضامینِ فرحت (اشاعتِ اوّل، حیدر آباد دکن) میں شامل اِس خاکے کے مَتن کو

بنیاد بنایا ہے اور جو فاش اور قطعی طور پر واضح اغلاطِ کتابت ہیں، اُن کی تصحیح رسالۂ اردو میں شائع شدہ مضمون کی مدد سے کی گئی ہے۔ آخر میں طلبہ کے استفادے کے خیال سے ضروری الفاظ کی فرہنگ بھی شامل کردی گئی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا بہ طورِ خاص شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اِسے مطبوعاتِ انجمن میں شامل کیا۔

رشید حسن خاں
یکم ستمبر ۱۹۹۱ء

ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی

کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی

اللہ اللہ ! ایک وہ زمانہ تھا کہ مَیں اور داؔنی ، مولوی صاحب مرحوم کی باتیں سُنتے تھے۔ اُن کی ہمّت ہماری ہمت بڑھاتی تھی ، اُن کا طرزِ بیان ہماری تحریر کا رہبر ہوتا تھا ، اُن کی خوش مذاقی خود اُن کو ہنساتی اور ہمارے پیٹ میں بَل ڈالتی تھی ، اُن کی تکلیفیں خود اُن کو پُرنَم اور ہم کو تڑپاتی تھیں ، اور آج وہ دن ہے کہ اُن کے حالات زبانِ قلم پر لانے سے ڈر لگتا ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ وہ بُزرگ ہستی اُخُوّتِ اسلامی کا سبق پڑھے ہوئے تھی ۔ اُس کو اپنے بَل بوتے پر ترقّی کرنے پر ناز تھا ۔ وہ چھوٹے درجے سے بڑے درجے پر ترقّی کرنا اپنا کارنامہ سمجھتی تھی ۔ اُس نے جو کچھ کِیا اور جو کچھ کر دِکھایا ، وہ کسی کی خوشامد ، کسی کی سفارش یا کسی خاندانی وَجاہت کے باعِث نہ تھا ۔ وہ تھا اور دُنیا کا وسیع اکھاڑا ۔ وہ اپنے دست و بازو کے بھروسے پر اِس میدان میں اُترا ، ہر مصیبت کا سامنا اپنی ذاتی قابلیت و ہمّت سے کِیا ۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا ، اُس کی تکمیل میں خون پانی ایک کر دیا اور دُنیا پر بہ خوبی ثابت کر دیا کہ بے یاری و مددگاری ، ترقّی کی راہ میں ایسی رُکاوٹیں نہیں ہیں جو بہ آسانی ہٹائی نہ جاسکیں اور خاندانی تعلّقات کی عَدَم مَوجودگی ، ایسی چیز نہیں ہے جو مانِعِ ترقّی ہو سکے ۔ جب کبھی جُوش میں آتے ، تو ہمیشہ " I am a self made man " کا فِقرہ ضرور استعمال کِیا کرتے

اور جب کبھی اِس پہلو پر نصیحت کرتے، تو ہمیشہ یہی فرماتے کہ بیٹا! جو کچھ کرنا ہے خو کرو، باپ دادا کی ہڈیوں کے واسطے سے بھیک نہ مانگتے پھرو۔

انسان فطرت سے مجبور ہے۔ جب دُنیا کی نظریں اُس پر پڑنے لگتی ہیں، تو وہ ہمیشہ اپنی پہلی حالت کی کمزوریوں کو چھُپاتا اور خوبیوں کو دکھاتا ہے۔ جس طرح بڑے بڑے گھرانوں کی نا اَہل اولاد اپنے باپ دادا کے نام سے اپنی نالائقی کو چھُپاتی ہے، اُسی طرح غریب گھرانوں کی لائق اَولاد چاہتی ہے کہ اُن کے باپ دادا کے نام لوگوں کے دِلوں سے مَحو ہو جائیں۔ یہ ہے ہماری اَخلاقی کمزوری اور یہ ہے ہماری اِسلامی سبق سے بے خَبری۔ ایک مولوی نذیر احمد خاں تھے، جو اپنے آبا و اَجداد کا نقشہ اصلی رنگ میں دِکھاتے تھے اور اُس پر فخر کرتے تھے۔ اُن کو اپنی اِبتدائی غُربت پر ناز تھا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ "میاں! اگر لفٹنٹ گورنر کے بیٹے ہو، تو کم سے کم ڈپٹی کمشنر تو ہو جاؤ۔ دس روپے کے اہل کار ہو کر، باپ کو لفٹنٹ گورنر کہتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی!"

بہ ہر حال یہ فطرتِ انسانی کا خیال تھا جس نے اب تک مجھے مولوی صاحب مرحوم کے حالات لکھنے سے رُوکا۔ بہت کچھ لکھ لیا تھا، وہ پھاڑ ڈالا کہ کہیں اینچن پھُوٹر گھسیٹن میں نہ پڑ جاؤں۔ رہ رہ کر جُوش آتا تھا اور ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ خُدا بھلا کرے مولوی عبدالحق صاحب کا کہ اُنھوں نے مجھے اِس اگر مگر سے نکالا اور دل کی باتوں کو حوالۂ قلم کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اب جو کچھ کانوں سے سُنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا، خواہ کوئی بُرا مانے یا بھلا۔ جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں دِکھاؤں گا، وہاں اُن کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کر دوں گا، تاکہ اُس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے اور یہ چند صفحات، ایسی سوانح عُمری نہ بن جائیں جو کسی کے خوش کرنے یا جلانے کو لکھی گئی ہو۔

میں واقعات کے بیان کرنے میں کوئی سلسلہ بھی قائم نہ کروں گا، کیونکہ یہ بناوٹ کی صورت ہے۔ جس موقعے پر جو کچھ سُنا یا دیکھا، اُس کو جوں کا توں لکھ دوں گا اور ہمیشہ اِس اَمر کی کوشش کروں گا کہ جہاں تک ممکن ہو، واقعات

مولوی صاحب ہی کی زبان میں بیان کیے جائیں۔ اِنشاءاللہ واقعات کے اِظہار میں مجھ سے غلطی نہ ہوگی، ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض نام، بھول جانے کی وجہ سے، چھوڑ جاؤں یا غلط لکھ جاؤں۔ اب رہا سچ یا جھوٹ، تو اُس کی مجھے پروا نہیں۔ میں اپنے مُحترَم اُستاد کے حالات لکھ رہا ہوں، اگر سچ ہیں، تو میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ اگر جھوٹ ہیں، تو وہ خود میدانِ حشر میں سوُد در سوُد لگا کر تاوان وُصول کرلیں گے۔

اب رہا طرزِ بیان، تو اُس میں مَتانت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہوں، کیوں کہ مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے میں متانت کو دخل دینا، اُن کا مُنہ چڑانا ہی نہیں، اُن کی توہین کرنا ہے، بلکہ یوں کہو کہ سیّد انشا کو میر اور مارک ٹوئین کو امرسن بنانا ہے۔ جب اپنی زندگی میں اُنھوں نے میری شُوخ چشمی کی ہنس ہنس کر داد دی، تو کوئی وجہ نہیں کہ اب وہ اپنی وَضع داری کو بدل دیں اور میری صاف گوئی کو گستاخی قرار دے کر دعوے دار ہوں ـــــ چل رے خامے بسم اللہ۔

۱۹۰۳ء میں میاں دانی نے اور میں نے ہندو کالج دہلی سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور دونوں مشن کالج میں داخل ہو گئے۔ ایف۔ اے میں میرا مضمونِ اختیاری سائنس اور دانی کا عربی تھا۔ اُنھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بی۔ اے میں عربی لے لو، دونوں کو ایک دوسرے سے مدد ملے گی اور اِمتحان کی تیاری میں سہولت ہوگی۔ مجھے اپنے حافظے پر گھمنڈ تھا، یہ بھی نہ سمجھا کہ اِس مضمون کو سنبھال بھی سکوں گا یا نہیں، جھٹ راضی ہو گیا۔ اَلقصّہ ہم دونوں بی۔ اے کے درجۂ ابتدائی میں شریک ہو گئے۔ ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جمیلُ الرّحمان صاحب تھے۔ بڑے اللہ والے لوگ تھے، عربی کا گھنٹا بہ آسانی تَصوُّف کی باتوں میں گزر جاتا تھا، کچھ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیتے تھے۔ دانی کچھ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں، کم ترین تو تُوتے کی طرح حِفظ کر لیتا تھا۔ اب رہی صَرف و نَحو، اُس میں، تو کورے کا کورا ہی رہا۔

سُنتے آئے ہیں کہ مصیبت کہہ کر نہیں آتی، لیکن یہ نہیں سُنا تھا کہ عربی کے پروفیسر کہہ کر نہیں جاتے، ایک دن جو مولوی صاحب کے کمرے میں ہم دونوں پہنچے تو دیکھا

کہ کمرا خالی ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کل شام کو استعفا دے کر کعبۃُ اللہ چل دیے۔ پرنسپل صاحب کے پاس پہنچے تو اُنھوں نے کورا جواب دے دیا کہ ہم عربی کی جماعت کا بندوبست نہیں کر سکتے، بہتر یہ ہے کہ مضمون تبدیل کر لو۔ میں نے دانی سے کہا کہ بھئی تمھارے کہنے سے میں نے عربی لی تھی، اب میرے کہنے سے تم سائنس لے لو۔ جس سہولت کی بنا پر تم نے میرا مضمون بدلوایا تھا، اب اُسی سہولت کے مدِنظر اپنا مضمون بدلو۔ بہ قولِ شخصے کہ "مرتا کیا نہ کرتا" وہ راضی ہو گئے۔ دفتر میں جاکر جو لیکچروں کا حساب کیا، تو معلوم ہوا کہ مضمون تبدیل کرنے کا وقت نہیں رہا، لیکچر کم رہ جائیں گے اور اِس طرح بجائے دو سال کے تین سال میں شریکِ امتحان ہونا پڑے گا۔ سنگ آمد و سخت آمد۔

جب "وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دُکان اپنی بڑھا گئے"، کی صورت آپڑی، تو دوسرے ٹھکانے کی تلاش ہوئی۔ دونوں سر مِلاکر بیٹھے، مشورے کیے، رزولیوشن پاس ہوئے، بالآخر یہ تجویز پاس ہوئی کہ "خاک از تودۂ کلاں بردار"، کے مقولے پر عمل کر کے کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہیے۔ دِلّی میں دو تین بڑے عربی داں مانے جاتے تھے: ایک مولوی محمد اسحاق صاحب، دوسرے شمسُ العُلَما مولوی ضیاءالدین خاں صاحب ایل۔ایل۔ڈی اور تیسرے مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔ پہلے کو تو دیوانگی سے فرصت نہ تھی، اِس لیے وہاں تو دال گلتی معلوم نہیں ہوئی، بالآخر قُرعہ دوسرے صاحب کے نام پر پڑا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، مولوی ضیاءُ الدین صاحب جامع مسجد میں رات کے دس گیارہ بجے تک بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے تھے، ہم دونوں نے بھی جاکر شام ہی سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ڈیرے ڈال دیے۔ آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے، مولوی صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل۔ خُدا خُدا کر کے دروازے سے قندیل نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ہم دونوں بھی ہاتھ پانو جھٹک، خوشامد کے فِقرے کے فِقرے سوچ کھڑے ہو گئے۔

ہم آخری سیڑھیوں پر کھڑے تھے، اِس لیے دروازے میں سے پہلے قندیل نکلتی نظر آئی، اُس کے بعد، جس طرح سمندر کے کنارے سے جہاز آتا دِکھائی

دیتا ہے ، اُسی طرح پہلے مولوی صاحب کا عمامہ ، اُس کے بعد اُن کا نورانی چہرہ، سُرمگیں آنکھیں ، سفید ریشِ مُبارک ، سفید جُبّہ اور سب سے آخر زَرد بانات کی سلیم شاہی جوتیاں نظر آئیں۔ آہستہ آہستہ اُنھوں نے سیڑھیوں سے اُترنا اور اوپر تلے ہمارے سانس نے چڑھنا شروع کیا۔ ہم سوچتے ہی رہے کہ راستہ رُوک کر کھڑے ہو جائیں ، وہ سَٹ سے پاس سے نکل گئے۔ آخر ذرا تیز قدم چل کر اُن کو جالیا اور نہایت ادب سے دونوں نے جُھک کر فرّاشی سلام کیا۔ وہ سمجھے کوئی راہ گیر ہیں ، میری وَجاہت کی وجہ سے سلام کر رہے ہیں یا یہ نہ سمجھے کہ سائل ہیں ، اِن سے پیچھا چھُڑانا مشکل ہے۔ وہ تو سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے ، اور ہم نے وُہی پہلی والی ترکیب کی کہ چکّر کھا کر پھر سامنے آگئے۔ یہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکے ، پوچھا : میں نے آپ صاحبوں کو نہیں پہچانا ، کیا مجھ سے کوئی کام ہے ؟ رام کہانی بیان کر کے عرضِ مُدّعا زبان پر لائے۔ فرمانے لگے : تم کو معلوم ہے کہ میں پنجاب یونی ورسٹی کا مُمتحِن ہوں۔ بِجنسِہٖ اُسی لہجے میں یہ الفاظ ادا کیے جیسے اِس زمانے میں کوئی کہے : تم کو معلوم ہے کہ میں سی۔ آئی۔ ڈی کا انسپکٹر ہوں ! ۔ لیکن ہم جان سے ہاتھ دُھوئے بیٹھے تھے ، عرض کیا کہ ہم امتحان میں رعایت کے طالب نہیں ، تعلیم میں مدد چاہتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ تم کو تعلیم دینا اور پھر مُمتحِن رہنا میرے ایمان کے خلاف ہے ، کسی دوسرے کی تلاش کیجیے۔

ممکن ہے کہ یہ مَسئلہ کوئی جُزوِ ایمان ہو ، ممکن ہے کہ پنجاب یونی ورسٹی نے مولوی صاحب سے تعلیم نہ دینے کا حلف لے لیا ہو ، بہرحال کچھ بھی ہو ، اُنھوں نے ہم دونوں کو سلام عَلَیکُم کا ایک زور سے دَھکّا دے کر نوکر کو حکم دیا کہ آگے بڑھو۔ وہ حکم کا بندہ قندیل اُٹھا آگے چلا اور مولوی صاحب اُس کے پیچھے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے روانہ ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں یہ دونوں قُطّاعُ الطّریق پھر راستہ نہ روک لیں یا مگر مولوی صاحب کے طرزِ عمل اور سلام عَلَیکُم کے جھٹکے نے ہم دونوں کو مُضمَحِل کر دیا تھا ، جہاں کھڑے تھے ، وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور مولوی صاحب رہٹ کے کنوئیں کی گلی میں گُھس اپنے مکان میں داخل ہو گئے۔ چلو اُمید نمبر ۲ پر پانی پھر گیا ، لیکن

آیندہ کے لیے سبق مل گیا کہ ایسے زبردست دشمن پر کھلے میدان میں حملہ کرنا خطرناک ہے، ایسے رستم کو پکڑنے کے لیے شغاد بننا ضروری ہے۔

وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کونسل ہوئی اور رزولیوشن پاس ہوا کہ مولوی نذیر احمد صاحب پر حملہ عبدالرحمٰن کی آڑ میں کیا جائے۔ اب میاں عبدالرحمٰن کا حال بھی سن لیجیے۔ اُن کے والد کا نام سراج الدین صاحب تھا، نہایت نیک اور پرہیزگار شخص تھے، جوتوں کی دُکان تھی۔ مولوی نذیر احمد صاحب اِس دُکان کو ہمیشہ رقمی مدد دیا کرتے تھے اور روزانہ شام کو وہاں آکر بیٹھتے تھے۔ عبدالرحمٰن میرے ہم جماعت نہ تھے، لیکن آپس میں میل جول بہت تھا۔ مولوی صاحب کو اُن کی تعلیم کا بہت خیال تھا، چناں چہ اُنھی کی وجہ سے عبدالرحمٰن نے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات پاس کیے، اُنھی کی وجہ سے وکالت میں ترقی کی، یہاں تک کہ مولوی صاحب ہی کی دل چسپی کا نتیجہ ہے کہ اِس وقت دہلی میں اُن کی ٹکر کا کوئی مسلمان وکیل نہیں ہے۔ اُس زمانے میں یہ ایف۔ اے میں پڑھتے تھے۔

بہ ہرحال اسکیم تیار ہوگئی اور دوسرے ہی دن سے میں نے عبدالرحمٰن کو گانٹھنا شروع کیا۔ دو ایک روز کے بعد اُن سے اظہارِ مطلب کیا۔ کہنے لگے کہ بھئی مولوی صاحب کو فرصت کم ہے، کہیں انکار نہ کر بیٹھیں۔ میں نے کہا کہ میاں عبدالرحمٰن! تم اُن تک ہم کو پہنچا دو، اگر ہو سکے تو ایک دو کلمۂ خیر بھی ہمارے حق میں کہہ دو، آگے ہم جانیں اور ہماری قسمت۔ وہ راضی ہو گئے اور کہا کہ شام کو آٹھ بجے دُکان پر آجانا، میں مولوی صاحب سے ملوا دوں گا۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ ٹھیک آٹھ بجے ہم دونوں سراج الدین صاحب کی دُکان پر پہنچے۔ یہ دُکان فتح پوری کی مسجد کے قریب تھی۔ جاکر کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب بیٹھے سراج الدین سے کچھ رقم کا حساب کر رہے ہیں۔ ہم نے جاتے ہی فرشی سلام کیے اور خاموش تخت کے کونے پر بیٹھ گئے۔ سراج الدین صاحب نے خیریت پوچھی، عبدالرحمٰن ہمارے پاس آبیٹھے، مگر مولوی صاحب روپیوں کے حساب کتاب میں اِس قدر مشغول تھے کہ اُنھوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون آیا، کون گیا۔ میں نے سوچا کہ یہاں بھی معاملہ پٹتا معلوم نہیں ہوتا، دھتکار

سُن کر یہاں سے بھی نکلنا پڑے گا۔ سچ ہے ، مایوسی انسان کو ہمت والا بنا دیتی ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا ، میں نے بھی سوچ لیا کہ آج اِس پار یا اُس پار۔ مولوی ضیاءُ الدّین صاحب تو بچ کر نکل گئے ، لیکن مولوی نذیر احمد صاحب سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے۔

قصّہ مختصر مولوی صاحب حساب سے فارغ ہوئے اور پوچھا کہ یہ دونوں صاحب کون ہیں ؟ عبدالرحمٰن نے ہمارے نام بتائے ، کچھ اُلٹے سیدھے خاندانی حالات بھی بیان کیے ، اُس کے بعد ہماری مصیبت کا بھی ذرا سا تذکرہ کیا اور خاموش ہو گئے۔ میں نے دِل میں کہا : پَرائے بِرتے کھیلا جُوا ، آج نہ مُوا ، کل مُوا ، اب میاں عبدالرحمٰن کو رہنے دو ، جو کچھ کہنا ہے خود کہہ ڈالو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں سے بھی بے نَیلِ مَرام باضابطہ پسپائی ہو۔ میں نے نہایت رِقّت آمیز لہجے میں اپنی مصیبت کا تذکرہ شُروع کیا۔ فرمانے لگے : تو عربی چھوڑ دو ، سائنس پڑھو۔ بیٹا ! آج کل مسلمانوں کو سائنس کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں مَثَل ہے : پڑھیں فارسی بیچیں تیل ، یہ دیکھو قدرت کے کھیل۔ فارسی پڑھ کر تیل تو بیچ لو گے ، عربی پڑھ کر تیل بیچنا بھی نہ آئے گا۔ اُن کی اِس پُر مذاق گفتگو سے ہم دونوں کے دل بڑھ گئے۔ ہم رہنے والے ٹھہرے جامع مسجد کے نیچے کے ، بھلا ایسی باتوں میں ہم سے کون وَر آسکتا ہے ، ہم نے بھی ایسے ہی شگفتہ الفاظ میں جواب دیا۔ مولوی صاحب پہلے تو مسکراتے رہے ، اُس کے بعد کِھلکِھلا کر ہنس دِیے۔ داتی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ یہ بڑا غریب معلوم ہوتا ہے ، مگر تو بڑا بدمعاش ہے۔ بیٹا ! جاؤ کسی دوسرے مولوی صاحب کی تلاش کرو۔ دِلّی میں کیا مولویوں کا کال ہے ! مجھے ذرا بھی فرصت ہوتی تو کبھی انکار نہ کرتا۔ میں نے عرض کی کہ جنابِ والا کا اِرشاد بالکل صحیح ہے ، مگر جو مولوی ہیں ، وہ پڑھاتے نہیں اور جو پڑھاتے ہیں ، وہ مولوی نہیں ہیں۔ کہنے لگے : نہیں ، ایک آدھ ایسا بھی نکل آئے گا جو مولوی بھی ہو گا اور پڑھائے گا بھی۔ جناب شمسُ العُلَماء مولوی ضیاءُ الدّین خاں صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی (یہ الفاظ بہت طنز سے کہے) کے پاس جاؤ ، اُن کو فرصت بھی ہے اور عالم بھی ہیں۔ میں نے کہا کہ اِس کے ساتھ وہ پنجاب یونی ورسٹی کے مُمتَحِن بھی ہیں۔ کہنے لگے :

میں اِس کا مطلب نہیں سمجھا۔ یہاں تو جلے بیٹھے ہی تھے، جامع مسجد کی سیڑھیوں والا واقعہ
خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا۔ بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ بھئی تم بونڈوں سے ڈرنا
چاہیے۔ ضیاءُ الدّین کو اگر خبر ہو جائے کہ اُن کے اوصافِ حمیدہ وخصائلِ پسندیدہ سراجُ الدّین
کی دُکان پر اِس طرح معرضِ بحث میں آتے ہیں، تو یقین جانو کہ نالش ٹھونک دیں
اچھا بھئی میں تم کو پڑھاؤں گا، مگر تم بھاگ جاؤ گے۔ ہم دونوں کے مُنہ سے ایک ساتھ
نکلا: نہیں، ہرگز نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ چھٹی ایک دن کی نہ ہوگی۔ ہم نے کہا:
بہت خوب۔ مولوی صاحب نے کہا کہ عید بقرعید کو بھی آنا پڑے گا۔ ہم نے کہا: بہت
مناسب، کل کس وقت حاضر ہوں؟ مولوی صاحب تھوڑی دیر تک اُنگلیوں پر کچھ
اپنے وقت کا حساب کرتے رہے، اُس کے بعد کہا: "دوپہر کو ڈیڑھ بجے"۔ ہم نے
کہا: بہت خوب۔ چوں کہ اِن باتوں میں رات زیادہ ہو گئی تھی، اِس لیے مولوی صاحب
دُکان سے اُٹھے۔ ہم سب نے سلام کیا اور وہ وَعَلَیکُمُ السّلام کہتے ہوئے تشریف لے گئے

یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ سراجُ الدّین صاحب نے وقتاً فوقتاً ہماری ہاں میں ہاں
مِلا کر اِس فیصلے میں بڑی مدد کی۔ ہم دونوں بھی خوش خوش اُٹھے اور سلام علیکم، وعلیکمُ السّلام
کرکے دُکان سے چلے۔ راستے میں داتی نے کہا: میاں مرزا! بڑے میاں نے مار ڈالا
بھئی گیارہ بجے کالج سے پڑھ کر نکلیں گے، کشمیری دروازے سے چل کر چوڑی والوں
آتے آتے ساڑھے گیارہ بج جائیں گے۔ دم نہ لینے پائیں گے کہ مولوی صاحب کے ہاں
چلنے کی تیاری کرنی پڑے گی۔ کہاں چاوڑی اور کہاں کھاری باولی، جون کا مہینا،
کہیں راستے میں لُو لگ کر ٹیں نہ ہو جائیں! میں نے کہا: میاں داتی! کچھ دنوں
چل کر دیکھو، شاید مولوی صاحب کو رحم آجائے، مگر اُن کو آخر تک رحم نہ آنا تھا
نہ آیا۔ لُطف یہ ہے کہ جاڑوں میں صُبح ساڑھے چھے بجے سے تعلیم کا وقت مُقرر ہوا،
لیکن ایمان کی بات ہے کہ مولوی صاحب ہی کی ہمّت تھی جو وہ ہمارے پڑھانے کو تیار
ہو گئے، بے چاروں کا ایک منٹ خالی نہ تھا اور اُنھوں نے جو وقت ہم کو دیا تھا،
وہ اپنے آرام کے وقت میں سے کاٹ کر دیا تھا۔ تقریباً دو برس تک ہم اُن سے پڑھتے

رہے یا نہ ہم نے کبھی گرمی یا سردی کی شکایت کی اور نہ کبھی وقت بدلنے کا لفظ زبان پر لائے، نہ اِن دو سال میں ایک دن ناغہ کیا۔ یہاں تک کہ مولوی صاحب بھی ہمیشہ کہتے تھے کہ بیٹا! جب تم دونوں آتے ہو، میرا دل خوش ہو جاتا ہے، کیوں کہ مَیں تم میں طالب علمی کی بو پاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تعلیم کس کو کہتے ہیں اور علم کیوں کر حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح ہم نے پڑھا ہے، کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ اِس زمانے کے لونڈوں پر اگر ایسی بپتا پڑے تو گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں، مگر (میری طرف دیکھ کر) اُستاد! تم سے مجھے کچھ توقّع نہیں، تم صرف بی۔ اے پاس کرنے کی فکر میں ہو۔ دانی کو شوق ہے، یہ عربی میں ترقّی کرے گا، مگر تم کورے کے کورے ہی رہو گے اور انشاء اللہ پانچ چھے ہی برس میں میری ساری محنت اکارت کر دو گے۔ خُدا کے فضل سے اُن کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

اِس سے پہلے کہ مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کا ذِکر کروں، مَیں مولوی صاحب کی شکل وصورت، مکان کی حالت، اُن کے رہنے سہنے کے طریقے اور اُن کے مشاغل کا نقشہ کھینچ دینا مناسب خیال کرتا ہوں، تاکہ مولوی صاحب کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ ہو سکے، لیکن سینو میٹو گراف کا یہ فلم چڑھانے سے قبل مَیں اپنے طرزِ بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں، کیوں کہ میری شوخی بعض جگہ حدِ تجاوز سے بڑھ جائے گی، لیکن آپ تمام قارئینِ کرام کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے، تو اِسی رنگ میں لکھتے اور اگر آپ اُن کی صحبت میں رہے ہوتے، تو آپ کو بھی اُن کے حالات لکھتے وقت میری ہی طرح معافی مانگنی پڑتی، ورنہ آپ کی تحریر، بجائے مولوی نذیر احمد صاحب کی سوانح عمری کے، کسی ٹھوٹھ مُلّا کے بے لطف واقعات کا ایک مجموعہ ہو جاتی۔ خُدا بہتر جانتا ہے کہ اِس وقت بھی لکھتے لکھتے پنسل ہاتھ سے رکھ دیتا ہوں اور ایک عالمِ بے خودی مجھ پر چھا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی کوئی بات نہ تھی جس میں خوش مذاقی کا پہلو نہ ہو۔ کوئی قصّہ نہ تھا جس میں ظرافت کوٹ کوٹ کر نہ بھری ہو۔ کوئی طرزِ بیان نہ تھا جو ہنساتے ہنساتے نہ لٹا دے۔ وہ دوسروں کو ہنساتے تھے اور چاہتے تھے

کہ دوسرے اپنی باتوں سے اُن کو ہنسائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم (اور خاص کر میں) مولوی صاحب کے سامنے بہت شوخ ہو گئے تھے، لیکن وہ طرح ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ کہا کرتے تھے کہ مجھے مُقطّع اور مُسمّسے شاگردوں سے نفرت ہے۔ اِس کے بعد بھی اگر کوئی صاحب یہ توقّع رکھیں کہ میں مولوی صاحب کے حالات متانت کا پہلو اِختیار کر کے لکھوں، تو میں اِس کا صرف یہی جواب دوں گا کہ "ہائے کم بخت! تو نے پی ہی نہیں"۔

لیجیے اب مولوی صاحب کا حُلیہ سُنیے ———— رنگ سانولا مگر روکھا۔ قد خاصا اُونچا تھا، مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔ دُہرا بدن، گدرا ہی نہیں بلکہ مُٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں وَرزِش کا شوق تھا۔ وَرزِش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح مُرمُروں کا تھیلا ہو جاتا ہے، بس یہی کیفیت تھی۔ بھاری بدن کی وجہ سے چوں کہ قد ٹھِنگنا معلوم ہونے لگا تھا، اِس لیے اُس کا تکمِلہ اونچی تُرکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا۔ کمر کا پھیر ضَرورت سے زیادہ تھا۔ تُوند اِس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں اِزار بند باندھنا بے ضَرورت ہی نہیں تکلیف دِہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہمد (تہ بند) باندھتے تھے، اُس کے پلّو اُڑسنے کی بجاے اِدھر اُدھر ڈال لیتے تھے، مگر اُٹھتے وقت بہت اِحتیاط کرتے تھے۔ اوّل تو قُطب بنے بیٹھے رہتے تھے، اگر اٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اُٹھنے کو مُلتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ضَرورت نے بہت مجبور کیا تو اِزار بند کی گرہ یا تہمد کے کونوں کے اُڑسنے کا دباؤ تُوند پر ڈالتے تھے۔

سر بہت بڑا تھا، مگر بڑی حد تک اُس کی صفائی کا اِنتظام قدرت نے اپنے اِختیار میں رکھّا تھا۔ جو تھوڑے رہے سہے بال تھے، وہ اکثر نہایت اِحتیاط سے صاف کرا دیے جاتے تھے، ورنہ بالوں کی یہ کگر، سفید مُقیّش کی صورت میں، ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی، ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ بھویں گھنی اور آنکھوں کے اُوپر سایہ اَفگن تھیں۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ وہ چمک نہیں جو غُصّے کے وقت نمودار ہوتی ہے، بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں

شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر میں اُن کو مسکراتی ہوئی آنکھیں" کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔

کلہ جبڑا بڑا زبردست پایا تھا۔ چوں کہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے مُحیط نے سانس کے لیے گنجایش بڑھادی تھی، اِس لیے نہایت اونچی آواز میں، بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔ آواز میں گرج تھی، مگر لوچ کے ساتھ، کوئی دُور سے جو سُنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں، لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو، جوش میں آکر جب آواز بلند کرتے تھے، تو معلوم ہوتا تھا کہ ترُم بج رہا ہے، اِسی لیے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں کو ایک ایک حرف صاف صاف سُنائی دیتا تھا۔

ناک کسی قدر چھوٹی تھی اور نتھنے بھاری، ایسی ناک کو گنواروں کی اِصطلاح میں "گاجر" اور دِلّی والوں کی بول چال میں "پھلکی" کہا جاتا ہے۔ گو مَتانت چھو کر نہیں گئی تھی، لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بہ خود مَتانت پیدا کر دی تھی۔ داڑھی بہت چھدری تھی، ایک ایک بال بہ آسانی گِنا جاسکتا تھا۔ کلّے تو کبھی قینچی کے مِنّت کش نہیں ہوئے، البتہ ٹھوڑی پر کا حصّہ کبھی کبھی ہموار کرالیا جاتا تھا۔ داڑھی کی وَضع قُدرت نے خود فرنچ فیشن بنادی تھی۔ بالوں میں سے ٹھوڑی اِس طرح دِکھائی دیتی تھی جیسے ایکس ریز (X Rays) ڈالنے سے کسی بکس کے اندر کی چیز۔ ٹھوڑی چوڑی اور اُن کے ارادے کے پکّے ہونے کا اِظہار کرتی تھی۔ گردن چھوٹی مگر موٹی تھی۔ لیجیے یہ ہیں مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔

اب رہی لباس کی بحث، تو اُس کا بھی حال سُن لیجیے۔ جنھوں نے اُن کو شالی رومال باندھے، کشمیری جُبّہ یا ایل۔ ایل۔ ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے، اُنھوں نے عالی جناب شمس العُلَماء، مولوی، حافظ، ڈاکٹر نذیر احمد خاں صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی مَدّ ظِلّہٗ العالی کو دیکھا ہے، مولوی نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا۔ اُن کے گھر کے اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

اگر اُن کو روزانہ باہر نکلنے شوق نہ ہوتا، تو لباس کی مد بھی اُن کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی۔ جب شام کو گھر سے نکلتے، تو عموماً تُرکی ٹوپی یا چھوٹا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے۔ گرمیوں میں نہایت صاف شفّاف سفید اچکن اور سفید کُرتا پیجامہ ہوتا، اور جاڑوں میں کشمیرے کی اچکن یا کشمیری کام کا جُبّہ۔ چوں کہ سراج الدین صاحب سے لین دین تھا، اِس لیے لال نری کا سلیم شاہی جوتا زیادہ استعمال کرتے تھے۔ پھر بھی وقت بے وقت کے لیے دو انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے، جن پر میری یاد میں پالش ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی، یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑ نک ہو گئے تھے۔ اُنھی کا پانو تھا کہ اُن چینیوں کے سے سخت جوتوں کی برداشت کرتا تھا۔ جُرابوں سے اُنھیں ہمیشہ نفرت تھی، گو دربار میں جانے کے لیے دو ایک جوڑیاں پاس رہتی تھیں۔

یہ تو پبلک کے مولوی صاحب ہوئے، اب ہمارے مولوی صاحب کو دیکھیے۔ آئیے میرے ساتھ چوڑی والوں سے چلیے۔ چوڑی والوں سے نکل کر چاوڑی میں آئیے۔ اُلٹے ہاتھ کو مُڑ کر، قاضی کے حوض پر سے ہوتے ہوئے، سِرکی والوں پر سے گزر کر لال کنوئیں پہنچیے۔ آگے بڑھیے تو بڑیوں کا کٹرا ہے، وہاں سے آگے چل کر نئے بانس میں آئیے۔ یہ سیدھا رستہ کھاری باولی کو نکل گیا ہے۔ نکڑ سے ذرا اِدھر ہی دائیں ہاتھ کو ایک گلی مُڑی ہے، یہ بتاشے والوں کی گلی ہے۔ بتاشے بنتے ہوئے ہم نے سب سے پہلے یہیں دیکھے۔ یہاں اچار، چٹنیوں والوں کی بیسیوں دکانیں ہیں، اُنھی دکانوں کے بیچ میں سے ایک گلی سیدھے ہاتھ کو مُڑی ہے، تھوڑی ہی دور جا کر بائیں طرف ایک پتلی سی گلی اُس میں سے کٹ گئی ہے، اُس گلی میں پہلا ہی مکان مولوی صاحب کا ہے۔ مکان دو منزلہ ہے اور نیا بنا ہوا ہے۔ صفائی کی یہ حالت ہے کہ تنکا پڑا ہوا نظر نہیں آتا۔ دروازے کے باہر دونوں پہلوؤں میں دو سنگیں چوکیاں ہیں۔ دروازے کو عبور کرنے کے بعد صحن میں آتے ہیں، صحن کسی قدر چھوٹا ہے۔ سیدھی طرف دفتر ہے، جہاں اکثر دو تین آدمی بیٹھے ہوئے کلام مجید پڑھا کیا کرتے

ہیں۔ اُس کے مُقابِل بائیں طرف باورچی خانہ ہے، چولھے بنے ہوئے ہیں، آگ جل رہی ہے؛ مگر برتن اور ہنڈیاں وغیرہ، جو باورچی خانے کا جُزِ لاینفک ہیں، سرے سے ندارد ہیں۔ آگ صرف حُقّے کے لیے سُلگائی جاتی ہے، کھانا دوسرے گھر سے پک کر آتا ہے۔ دروازے کے بالکل سامنے اِکہرا دالان ہے اور اندر ایک لمبا کمرا۔ گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ کمرے کے دو دروازے بند ہیں، ایک کھُلا ہے۔ باہر ایک بُڑھیا پھوننس چماری بیٹھی پنکھے کی رسّی کھینچ رہی ہے۔

ہاں تو میں کیا تصویر دِکھانا چاہتا تھا؟ مولوی صاحب کا لباس! مگر خُدا کے فضل سے اُن کے جِسم پر کوئی لِباس ہی نہیں ہے جس کا تذکرہ کِیا جائے۔ نہ کُرتا ہے نہ ٹوپی نہ پیجامہ، ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے۔ بندھی ہوئی نہیں ہے، مَحض لپٹی ہوئی ہے، لیکن گرہ کے جنجال سے بے نیاز ہے۔ کمرے میں نہایت اُجلی چاندنی کا فرش ہے۔ ایک طرف پلنگ بِچھا ہوا ہے، کبھی اُس پر چادر ہے، کبھی نہیں ہے۔ سرھانے تکیہ رکھّا ہے، مگر اُس کی رنگت کا بیان اِحاطۂ تحریر سے باہر ہے، البتّہ جس گاو تکیے سے مولوی صاحب لگے بیٹھے ہیں، وہ بہت صاف ہے۔ قالین بھی عُمدہ اور قیمتی ہے۔ اگر مولوی صاحب کی حالت دیکھ کر آپ سوال کر بیٹھیں کہ "مولانا! ایں چہ کاراست کہ کردہ؟" تو اِنشاء اللہ یہی جواب ملے گا کہ "مُحتَسِب را درونِ خانہ چہ کار"۔

جاڑوں میں مکان کے اوپر کے حصّے میں رہتے تھے، چلیے وہاں کا بھی رنگ دِکھادوں۔ صدر دروازے سے مِلا ہوا زینہ ہے اور سیڑھیوں کے خَتم ہونے پر غسل خانہ اور بَیتُ الخَلا ہے۔ اُس کے بعد ایک دروازہ آتا ہے۔ دروازے سے گزر کر چھت پر آتے ہیں۔ سامنے ہی ایک کمرا ہے اور اُس کے دونوں جانِب کوٹھریاں۔ غُسل خانے کے بالکل مُقابِل دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرا ہے۔ آخر آخر میں مولوی صاحب یہیں رہا کرتے تھے۔ جس زمانے میں ہم پڑھتے تھے، تو اُن کی نشست سامنے والے بڑے کمرے میں تھی۔ یہاں بھی چاندنی کا فرش ہے، اُس پر قالین، پیچھے گاو تکیہ،

سامنے ایک چھوٹی نیچی میز ، پہلو میں حُقّہ ۔ اُس کی حقیقت کَما حَقُّہٗ، بیان کرنا مشکل ہے ۔ مولوی صاحب کو حُقّے کا بہت شوق تھا ، مگر تمباکو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اُس کے دُھویں کی کڑواہٹ ، بیٹھنے والوں کے حَلق میں پھندا ڈال دیتی تھی ۔ فرشی قیمتی تھی ، مگر چلم پیسے کی دو والی ۔ اور نَیچہ تو خُدا کی پناہ ! اُس کے تیّار ہونے کی تاریخ لوگوں کے دلوں سے مُدّت کی محو ہو چکی تھی ۔ ایک آدھ دفعہ ایک صاحب نے نَیچہ بدلنے کا ارادہ بھی کیا ، مگر مولوی صاحب نے ، نَیچے کو جُورو کا مُترادِف قرار دے کر ، ایسا سخت فقرہ کسا کہ بے چارے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے ۔

خَیر ، جاڑے کا موسم ہے ، مولوی صاحب بیٹھے حُقّہ پی رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں ۔ سر پر کنٹوپ ہے ، مگر بڑا دقیانوسی ۔ کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈُوریاں نیچے لٹکتی ہوئیں ۔ کبھی اُس کے دونوں پاکھے اُوپر کی طرف سیدھے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈُوریاں ، طُرّے کا کام دیتیں ۔ کبھی پاکھوں کو سر پر اوپر تلے ڈوریوں سے کس دِیا جاتا اور اِس طرح کنٹوپ ، فلٹ کیپ کی شَکل اِختیار کر لیتا ۔ جسم پر روئی کی مرزئی ، مگر ایسی پُرانی کہ اُس کی روئی کی گرمی مدّت سے مائل بہ سردی ہو چکی ہے ۔ اوپر صندلی رنگ کا دُھسّا پڑا ہوا ۔ لیجیے دیکھا آپ نے ہمارے مولوی صاحب کو !

چار بجے اور مولوی صاحب نے آواز دی : پانی تیّار ہے ؟ جواب ملا : جی ہاں ۔ مولوی صاحب غسل خانے میں گئے ، کپڑے بدل (یا یوں کہو کہ جوُن بدل) باہر نکل آئے اور چلے ٹاؤن ہال کو ۔ اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے ، آپ کے مولوی صاحب ہو گئے ۔

گھر میں اِس لباس سے اِستِغنا کے کئی باعِث تھے ۔ اوّل تو یہ بات تھی کہ اُن کو اپنے کاموں ہی سے فرصت نہ تھی ، پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں اُن کا سارا دِن گزر جاتا تھا ۔ دوسرے یہ کہ وہ بہت کم لوگوں سے مکان پر ملتے تھے ۔ جس کو ملنا ہوتا تھا ، شام کو ٹاؤن ہال کی لائبریری میں اُن سے جا کر مل آتا تھا ۔

جو لوگ مکان پر آتے تھے، وہ یا تو اُن کے شاگرد ہوتے تھے یا خود صاحبِ کمال، اور ظاہر ہے کہ ایسے صاحبِ کمال لوگ ظاہری حالت کو نہیں دیکھتے، یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب ہیں کتنے پانی میں۔ لباس سے اِس بے اعتنائی کی تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے، کسی دوسرے کا دولت خانہ نہیں جانتے تھے۔ اُن کو جس طرح آرام ملتا، اُس طرح رہتے۔ جی چاہتا پہنتے، نہ جی چاہتا نہ پہنتے، البتہ جب باہر جاتے تو "کھائے مَن بھاتا، پہنے جگ بھاتا" پر عمل کرتے۔ اَصل عالِم تو گھر پر تھے، باہر نکل کر ظاہری عالِم بھی بن جاتے۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گھر میں کوئی عورت نہ تھی جو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی، یا کم سے کم اُن کا کنٹوپ، مرزئی یا سرھانے کے تکیے کا غلاف تو بدل دیا کرتی۔ گھر میں تھا کون، ایک مولوی صاحب، دوسرا ایک کانڑا ٹٹو، بدّھو نفر، اُن کا نوکر خدا بخش۔ وہ بھی ایسا بے پروا کہ خدا کی پناہ! ظالم نے بہرا بن کر کام سے اور اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا۔ مولوی صاحب کی آواز، جس سے مُردے قبر میں چونک پڑیں، اُس کو کبھی نہ سُنائی دی اور جب تک کسی نے جاکر اُس کا شانہ نہ ہلایا، اُس نے ہمیشہ سُنی کو اَن سُنی کر دیا۔ البتہ حُقّے کے معاملے میں بڑا تیز تھا۔ یا تو اُس کو یہ خیال تھا کہ حُقّے بغیر مولوی صاحب کے ہاں گُزارا ہونا مشکل ہے، یا یہ وجہ تھی کہ تمباکو زیادہ صرف کرنے میں اُس کو دو ایک پیسے رُوز مل جاتے تھے۔ غرض یہ حال تھا کہ حُقّہ پورا سُلگا بھی نہیں کہ وہ چلم اُٹھا کر چلا۔ مولوی صاحب "ہاں ہاں" کرتے ہی رہے، اُس نے جا چلم اُلٹ دی یا دوسرا سُلفہ رکھ، آگ بھر، چلم حُقّے پر لاکر رکھ دی۔ توا گرم، حُقّہ بھڑک گیا۔ میاں نوکر صاحب کو پھر بُلا کر توا ٹھنڈا کرنے اور چلم بھروانے کی ضرورت پیش آئی۔ غرض سارے دن اُن کا یہی کام تھا اور وہ اِس میں خوش اور بہت مگن تھے۔

جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اِس قدر پابند تھا کہ لوگ اُس کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے۔ بعض یورپ

پرست اُس کی پابندیِ اوقات کو یورپ والوں کا ہی حصّہ خیال کریں تو خیال کریں
میں تو یہ کہتا ہوں کہ صرف دہلی میں میں نے تین ایسے شخص دیکھے ہیں جو آندھی
آئے ، مینہ آئے ، رُوزانہ چھ بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں آتے تھے ۔ اِدھر اُنھوں
نے لائبریری کے دروازے میں قدم رکھا اور اُدھر گھنٹا گھر نے ٹن ٹن چھ بجائے ۔ لطف
یہ ہے کہ اُن میں سے ایک مشرق میں رہتا تھا ، تو دوسرا مغرب میں ۔ یہ تین
شخص کون تھے : ایک مُنشی ذکاءُ اللّٰہ صاحب ، دوسرے رائے بہادر پیارے لال
صاحب اور تیسرے مولوی صاحب ۔ ایک چیلوں کے کوچے سے آتا تھا ، دوسرا
دریبے سے اور تیسرا کھاری باولی سے ۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک نے آکر دوسرے
کا انتظار کیا ہو ۔ اگر اِن میں سے کوئی ایک نہ آتا ، تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ نہ آنے
والا ایسا بیمار ہے کہ چلنا دُشوار ہے اور یہ نتیجہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا ۔ میں نے
خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا ہے کہ اگر کسی شخص کو اِن تینوں میں سے
کسی سے مِلنا ہوتا اور چھ بجے سے ذرا پہلے لائبریری کے کسی ملازم سے جاکر دریافت
کرتا ، تو یہی جواب ملتا کہ اب آتے ہی ہوں گے ، چھ بجنے میں دو ہی منٹ تو رہ گئے ہیں ۔

دوسرے دو صاحبوں کا ٹائم ٹیبل تو مجھے معلوم نہیں ، البتہ مولوی صاحب کی
مصروفیتوں کا حال لکھتا ہوں ۔ اُن کے اِس نظامِ اوقات میں گرمی اور جاڑے کے
لحاظ سے کچھ کچھ تغیّر ہو جاتا تھا ۔ وہ ہمیشہ بہت سویرے اُٹھنے کے عادی تھے ۔ گرمیوں
میں اُٹھتے ہی نہاتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر نماز پڑھتے ۔ اُن کی صُبح کی اور
عصر کی نماز کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی ، باقی کا حال اللّٰہ کو معلوم ہے ، نہ میں نے دریافت کیا
اور نہ مجھ سے کسی نے کہا ۔ صبح کی نماز پڑھ کر کچھ تلاوت کرتے ۔ اِدھر ذرا دن چڑھا ،
اُدھر مولویوں کی جماعت اور خود مولوی صاحب کا ناشتا داخل ہوا ۔ اِس جماعت میں
بُخارا ، کابل ، سرحد وغیرہ کے لوگ تھے ۔ اُن کی تعداد کوئی ۱۵ ، ۱۶ تھی ۔ محنت
ایسی کرتے تھے کہ دوسرا کرے تو مر جائے ، لیکن ٹھوٹھ ایسے تھے کہ مولوی صاحب
بھی زِچ ہو جاتے تھے ۔ خوش مذاقی تو اُنھیں چھو کر نہیں گئی تھی ۔ خود مذاق کرنا

تو کُجا ، دوسرے کا مذاق بھی نہیں سمجھ سکتے تھے ۔ متانت اور ادب کا یہ حال تھا کہ آنکھ اُٹھا کر مولوی صاحب کو دیکھنا سوءِ ادبی سمجھتے تھے ۔ اب اُن کے "وہ عمامے اونچے اونچے ، یہ یہ لمبی داڑھیاں" دیکھو اور مولوی صاحب کی حالت کا اندازہ کرو ۔ بچارے ناشتا کرتے جاتے تھے اور اپنا فرض اُتارتے جاتے تھے ۔ عالم تھے ، دوسروں کو عالم بناتے تھے ، لیکن کہا کرتے تھے کہ اِن فتح پوری کے مُلّانوں کو پڑھا کر میرا دل بیٹھ جاتا ہے ۔ کیا کہوں "میں ہوں ہنسوڑ اور تو ہے مُقطّع ، میرا تیرا میل نہیں" کا نقشہ ہے ۔

یہ جماعت اُٹھی اور مولوی رحیم بخش صاحب آنازل ہوئے ، کاغذوں کا مُٹھا بغل میں ، ہاتھ میں پنسل ، کان میں قلم ۔ اِدھر فتح پوری کی جماعت نے کمرے سے قدم نکالا ، اُدھر انھوں نے کمرے میں قدم رکھا ۔ اب سلسلۂ تصنیف و تالیف شروع ہوا ۔ چوں کہ آخر آخر میں مولوی صاحب کے ہاتھ میں رعشہ آگیا تھا ، اِس لیے لکھوانے کا کام اکثر انھیں سے لیا جاتا تھا ۔ سب سے پہلے کلام مجید اور حمائل شریف کی کاپیوں کی صحت کی جاتی ۔ اُس کے بعد مطبعے کا حساب دیکھا جاتا اور پھر جدید تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا ۔ یہ کام سمٹتے سمٹتے ساڑھے گیارہ ، پونے بارہ بج جاتے ۔ رحیم بخش صاحب کے اُٹھتے ہی کھانا آتا ۔ کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹ گئے ۔ اُدھر ڈیڑھ بجا اور اِدھر ہم دونوں داخل ہوئے ۔ ہمارا قدم رکھنا تھا کہ مولوی صاحب اُٹھ بیٹھے ، ساڑھے تین بجے تک ہم سے سر مغزنی کرتے رہے ۔ اگر کوئی دِل چسپ بحث یا قصّہ چھڑ گیا تو چار بج گئے ۔

چار بجے اور مولوی صاحب غسل خانے میں گئے ۔ نہائے دھوئے ، کپڑے پہن نکل کھڑے ہوئے ۔ پہلے شمس العارفین کی دُکان پر ٹھہرے ۔ یہاں بھی اُن کا حساب کتاب تھا ۔ وہاں کا کھاتا دیکھا ، جو کچھ لینا دینا تھا ، لیا دیا اور سیدھے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں پہنچ گئے ۔ سات بجے تک وہاں ٹھہرے ، جس کو ملنا ہوا ، وہ وہاں مل لیا ۔ سات بجے وہاں سے اُٹھ کر سراج الدین صاحب کی دُکان پر آئے ، یہاں بھی حساب کتاب کیا ، عبدالرحمٰن کو پڑھایا ۔ گھنٹا بھر یہاں ٹھہر کر مکان پہنچ گئے ۔ کھانا کھایا ،

کچھ لکھا پڑھا اور دس بجے سُو رہے ۔ جاڑے میں پروگرام میں یہ تبدیلی ہو جاتی تھی
کہ پہلے صبح ہی صبح ہم پہنچتے تھے ، اُس کے بعد مولویوں کی جماعت آتی تھی ۔ رحیم بخش
صاحب کا نمبر سہ پہر میں آتا تھا ۔

خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے ۔ ناشتے میں دو نیم برشت
انڈے ضرور ہوتے تھے ۔ میوے کا بڑا شوق تھا ۔ ناشتے اور کھانے کے ساتھ میوے
کا ہونا لازم تھا ۔ پڑھاتے جاتے اور کھاتے جاتے تھے ، مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ
کبھی شریکِ طعام نہ ہو سکا ۔ خیر ، اُن پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلا کرتے ۔ اُن کے لیے
تو مولوی صاحب کا ناشتا ، اُونٹ کے مُنہ میں زیرہ ہو جاتا ، البتہ ہم دونوں کی صلا
نہ کرنا غضب تھا ۔ کہتے بھی جاتے تھے بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے ! میاں کیا
مزے کا آم ہے ! مگر بندۂ خُدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا ! ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا
ہے ۔ میں نے تو تہیّہ کر لیا تھا [میاں ذاتی اب انکار کریں تو کریں ، لیکن اُن کا بھی
یہی ارادہ تھا] کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے مُنہ بھی شریک ہونے کو کہیں ، تو ہم
سچ مُچ شریک ہو جائیں ۔

مولوی صاحب کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا اور
اِس غرض کے حاصل کرنے میں اُن کو مالی مدد دینے میں کبھی انکار نہ ہوتا تھا ۔
بے دریغ روپیہ دیتے تھے اور اکثر بڑی بڑی رقمیں ڈبو بیٹھتے تھے ۔ کہا کرتے تھے :
" میاں میں سچ کہتا ہوں کہ اِس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپے کھو بیٹھا
ہوں ، پھر بھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دُکان داروں سے فائدہ پہنچا ہے ، اُس نے
میرے نقصان کی تلافی ہی نہیں کر دی ، بلکہ کچھ نفع ہی پہنچا دیا ہے ۔ بیٹا ! تم بھی تجارت
کرو ، روپیہ میں دیتا ہوں ۔ نوکری کی کھکھیڑ اُٹھاؤ گے ، تو مزا معلوم ہو گا ۔ "
جس طرح روپیہ دل کھول کر دیتے تھے ، اُسی طرح حساب بھی بڑی سختی سے لیتے
تھے ۔ گرمی ہو یا جاڑا ، دھوپ ہو یا مینہ ، قرض داروں کے ہاں اُن کا روزانہ چکر
نہیں چھوٹتا تھا ۔ گئے اور جاتے ہی پہلے غلّق پہ قبضہ کیا ، اُس کے بعد کھاتا دیکھا ،

کر دی دیکھی، سامان دیکھ کر بکری کا اندازہ کیا، روپیہ جیب میں ڈالا، سلام علیکم وعلیکم السّلام کیا اور چل دیے۔ دوسرے دُکان دار کے پاس پہنچے اور وہاں بھی وہی پہلا سبق دُہرایا۔ کوڑی کوڑی کا حساب دیکھتے، اعتراضوں کی بوچھاڑ سے پریشان کرتے اور کہتے جاتے: "بھئی حساب جَوجَو، بخشش سَوسَو"۔ فقرے کے پہلے جُزو سے تو بچاروں کو روزانہ واسطہ پڑتا، لیکن دوسرے جُزو کا دیکھنا کبھی کسی کو نصیب نہ ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر واقعی بازار کے مندا ہونے یا کسی اور وجہ سے اُن کے کسی قرض دار کا نقصان ہو جاتا یا دیوالہ نکل جاتا، تو پھر اُس قرضے کا ذکر زبان پر نہ لاتے۔

اُن کو خیال تھا کہ دہلی کے پنجابی تجارت کو خوب سمجھتے ہیں، اُن کو دِل کھول کر روپیہ دیتے تھے اور اکثر اُنھیں کے ہاتھوں نقصان اُٹھاتے تھے۔ مثال کے طور ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک صاحب، جن کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں، مولوی صاحب کے پاس آئے، تجارت کا ذِکر چھیڑا اور مولوی صاحب کو ولایتی جوتوں کے فائدے کے وہ سبز باغ دِکھائے کہ تیسرے ہی رُوز، بلا کسی طمانیت کے، گیارہ ہزار روپے کا چک مولوی صاحب نے اُن کے نام لکھ دیا۔ بڑے ٹھاٹھ سے سُنہری مسجد کے قریب دُکان کھُولی گئی۔ مولوی صاحب جاتے، گھڑی دو گھڑی وہاں بیٹھتے، دُکان دار صاحب کی لچھے دار باتیں سُنتے، چلتے وقت کچھ روپے جیب میں ڈالنے کو مل جاتے، اِس لیے خوش خوش، بغیر حساب کیے گھر آجاتے۔ یہی ٹھوکر تھی جس نے مولوی صاحب کو چوکنّا کر دیا تھا اور وہ بغیر حساب کتاب دیکھے روپے کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے تھے۔ قصّہ مُختصر، اصل میں سے دو ڈھائی ہزار روپیہ مولوی صاحب کو تھما، اُس نے دیوالہ نکال دیا۔ قُرقی ہوئی، مال نیلام چڑھا اور اُس میرے یار نے کُل سامان دوسروں کے ذریعے سے خود خرید لیا۔ مولوی صاحب کو اِس چال کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اُس کے بعد آیا، بہت رُویا، بہت آنسو بہائے۔ مولوی صاحب سمجھے بچارے کو بڑا رنج ہوا، کہا: "جاؤ بھئی جاؤ، تجارت میں یہی ہوتا ہے، یا اِس پار، یا اُس پار"۔ چلو گئی گزُری بات ہوئی۔

ایک رُوز خُدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ یہ چاوڑی میں جا رہے تھے، کچھ جھٹپٹا ہوا تھا، کیا دیکھتے ہیں کہ دُکان دار صاحب خوب پیے ہوئے، عطر میں بسے، پھولوں کا کنٹھا گلے میں ڈالے، ایک رنڈی کا ہاتھ پکڑے کوٹھے سے اُترے اور آکر ایک کھلی گاڑی میں سوار ہوئے۔ مولوی صاحب نے جو یہ رنگ دیکھا تو وہیں ٹھٹک گئے۔ اتنے میں اُنھوں نے بھی مولوی صاحب کو دیکھا، بہت مُسکرا کر سلام کیا۔ رنڈی نے چُپکے چُپکے کچھ دریافت کیا، تو ایک قہقہہ لگایا اور اونچی آواز میں کہا کہ "یہ سب کچھ مولوی صاحب ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔" مولوی صاحب کے آگ لگ گئی، دوسرے ہی دن نالش ٹھونک دی اور آخر اُن کو ٹھکانے لگا کر دم لیا۔ لوگوں نے سفارشیں بھی کیں، اُنھوں نے خود بھی آکر بہت کچھ توبہ تلا کی، لیکن یہ نہ ماننا تھے نہ مانے اور آخر جب اُس کو ٹھک کر دیا، اُس وقت اُن کو چین آیا۔

دین لین سب کچھ کرتے تھے، مگر حساب کتاب صرف دوسروں کی کتابوں یا اُن کے دل میں تھا۔ کچھ تھوڑا بہت، لوگوں کے کہنے سُننے سے، مُتفرق پرچوں پر لکھ بھی لیا تھا، لیکن اتنے بڑے بیوپار کے لیے جیسا دفتر چاہیے، وہ اُنھوں نے نہ رکھنا تھا نہ رکھا۔

سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے۔ اگر کوئی حُجّت کرتا، تو مارے تاویلوں کے اُس کا ناطقہ بند کر دیتے۔ ایک تو حافظ، دوسرے عالم، تیسرے لسّان، بھلا اُن سے کون وَر آسکتا تھا۔ اور تو اور، خود مجھ سے سود لینے کو تیّار ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر مُتفرّق قرضے تھے، خیال آیا کہ ایک جگہ سے قرض لے کر سب کو ادا کر دیا جائے۔ قرضہ کس سے لیا جائے، یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ ہر پھر کر مولوی صاحب ہی پر نظر جاتی تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں نے مولوی صاحب سے سوال کر ہی دیا۔ کہنے لگے: کتنا روپیہ چاہیے۔ میں نے کہا: بارہ ہزار۔ بُولے: ضمانت۔ میں نے کہا: چوڑی والوں والا مکان۔ پوچھا: کتنی مالیّت کا ہے؟ میں نے کہا: کوئی ساٹھ ستّر ہزار روپے کا۔ فرمایا: کل قبالہ لیتے آنا۔ میں نے دل میں سوچا: چلو چھٹی ہوئی، بڑی

جلدی مُعاملہ پٹ گیا۔

دوسرے دن قبالہ لے کر پہنچا۔ پڑھ کر کہا: ٹھیک ہے، مگر بیٹا! سود کتنا دو گے؟ میں نے کہا: مولوی صاحب، آپ اور سود! کہنے لگے: کیوں، اِس میں کیا ہرج ہے؟ میں نہ دوں گا، تو کسی ساہوکار سے لو گے، اُس کو خوشی سے سود دو گے۔ ارے میاں! مجھے کچھ فائدہ پہنچاؤ گے تو دین دُنیا دونوں میں بھلا ہوگا۔ آخر میں تمھارا اُستاد ہوں یا نہیں! میرا ابھی کچھ حق تم پر ہے یا نہیں! جاؤ شاباش، بیٹا! اپنے چچا سے جاکر تصفیہ کر آؤ، کل ہی چک بنگال بینک کے نام لکھے دیتا ہوں۔ میں نے کہا: مولوی صاحب! لوگ کیا کہیں گے کہ مولوی ہوکر سود لیتے ہیں، اور لیتے ہیں کس سے، اپنے شاگردوں سے۔ کہنے لگے: اِس کی پروا نہ کرو۔ جب مجھ پر کُفر کا فتوی لگ چکا ہے، تو اب مجھے ڈر ہی کیا رہا! جاؤ تمھارے ساتھ یہ رعایت کرتا ہوں کہ اَوروں سے روپیہ سیکڑا لیتا ہوں، تم سے چودہ آنے لوں گا ——— میں نے آکر گھر میں ذِکر کیا ——— ہم کو دوسری جگہ سے آٹھ آنے سیکڑے پر روپیہ مل گیا، اِس لیے یہ مُعاملہ یوں کا یوں ہی رہ گیا۔

لیجیے یہ قصّہ تو سُنا چکا، اب اَصل کہانی کی طرف رُجوع کرتا ہوں اور مولوی صاحب کی اِبتدائی تعلیم کے واقِعات، جو اُن کی زبانی سُنے تھے، بیان کرتا ہوں۔

ایک رُوز مولوی صاحب مُعلّقات پڑھا رہے تھے، عَمرو بن کلثوم کا قصیدہ تھا، جب اِس شعر پر پہنچے:

اَبَاهِندٍ فَلَاتَعجَل عَلَينَا وَانظِرنَا نُخبِرکَ اليَقِينَا

تو بہت ہنسے، کتاب رکھ دی اور ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے! شعر میں تو کوئی ہنسی کی بات نہیں، پھر مولوی صاحب کو یہ کیا مَرض اُٹھا ہے۔ آخر جب ہنسنے کا ذرا زُور کم ہوا، تو وجہ دریافت کی۔ مولوی صاحب پھر ہنسنے لگے، تھوڑی دیر کے بعد سنبھل کر بولے: میاں! بعض شعر قصّہ طلَب ہوتے ہیں۔ یہ شعر میری زندگی کے قصّے کا آغاز ہے۔ اچھا تو سُناتا ہوں،

مگر پہلے تمہید سُن لو۔ بھئی ہم بہت غریب لوگ تھے، نہ کھانے کو رُوٹی، نہ پہننے کپڑا۔ تعلیم کا شوق تھا اِس لیے پھرتا پھراتا پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں ٹھہر گ یہاں کے مولوی صاحب بڑے عالم تھے، اُن سے پڑھتا اور توکّل پر گزارا کرتا۔ مولو صاحب کے دو چار شاگرد اور بھی تھے، اُنھیں بھی پڑھاتے، مجھے بھی پڑھاتے دن رات پڑھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ تھوڑے دنوں میں کلام مجید پڑھ کر میں نے ادب پڑھنا شروع کیا۔ چار پانچ برس میں مُعلّقات پڑھنے لگا۔ گو عُمر میری بارہ سال کی تھی، مگر قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے نو دس برس کا معلوم ہوتا تھ

پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھبڑی ہاتھ میں لے گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دے دی کسی نے قیمے کی لُگدی ہی رکھ دی، کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخایا؛ غرض رنگ بہ رنگ کا کھانا جمع ہوجاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا، اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے، اُنھی کے بیٹے ڈپٹی عبدالحامد صاحب ہیں، جو سامنے والے مکان میں رہتے ہیں۔ اُن کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ اِدھر میں نے دروازے میں قدم رکھا، اُدھر اُن کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پِسوا لیتی، نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلّے بھر کا مصالحہ اُٹھا لاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹّے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں نے ہاتھ رُوکا اور اُس نے بٹّا انگلیوں پر مارا، بہ خُدا جان سی نکل جاتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے کئی دفعہ شکایت بھی کی، مگر اُنھوں نے ٹال دیا۔ خبر نہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی، چلتے چلتے تاکید کر دیا کرتے تھے کہ عبدالخالق صاحب کے مکان میں ضرور جانا۔ بہ ہر حال مارا دھاڑی رُوز وہاں جانا پڑتا اور رُوز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی۔ تم سمجھے بھی کہ یہ لڑکی کون تھی؟ میاں! یہ لڑکی وہ تھی جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں۔ جب سُوچتا ہوں تو پچھلا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور بے اِختیار ہنسی آجاتی ہے۔ اکثر ہم دونوں پہلی باتوں کو یاد

کر کے خوب ہنستے تھے۔ خدا غریقِ رحمت کرے، جیسی بچپن میں شریر تھیں، ویسی ہی جوانی میں غریب ہو گئیں۔ اُن کے مرنے کے بعد ہماری تو زندگی کا مزا جاتا رہا۔ بھئی دیکھنا، میں نے کیسے مزے کی تاریخ کہی ہے! اِس کے بعد اُنھوں نے عربی کے چار پانچ اشعار کا قطعہ سُنایا، مادّہ تاریخ "لہا عفر" تھا۔ میں نے بڑی زور سے "اوں ہوں" کی۔ بگڑ کر میری طرف دیکھا اور کہا: کیوں، آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟ میں نے عرض کی: جی نہیں، لیکن اِس قطعے کو سُن کر مجھے دبیر کی ایک رُباعی یاد آگئی، کیا خوب لکھی ہے، فرماتے ہیں:

ہم شانِ نجف نہ عرشِ انور ٹھہرا
میزاں میں یہ بھاری، وہ سُبک تر ٹھہرا
اِس پلّے میں تھا نجف اور اُس پلّے میں عرش
پہنچا وہ فلک پر، یہ زمیں پر ٹھہرا

بڑے غور سے سُنتے رہے، پھر کہنے لگے: یہ تو بے معنی ہے۔ نجف کی جگہ دُنیا کی جس چیز کو رکھ دو، اُس سے یہ رُباعی متعلق ہو جائے گی اور وہ عرش سے بھاری ثابت ہو گی۔ میں نے عرض کی کہ آپ کے قطعے کو اِس سال میں مرنے والی جس عورت سے متعلق کر دو، متعلق ہو جائے گا۔ اِس تاریخ میں خوبی ہی کیا ہے۔ اوّل تو ایسی عام تاریخیں کچھ قابلِ تعریف نہیں ہوتیں۔ دوسرے سرسیّد کی تاریخِ انتقال "غفر لہ" پر آپ نے صرف الف کا اضافہ کر کے، اُس کو اپنا مال کر لیا ہے۔ مُسکرا کر کہنے لگے: اچھا بھئی تو ہی سچّا سہی، اب اِس جھگڑے کو چھوڑو اور میری اصل کہانی کو لو۔

ہاں تو فرصت کے وقت ہم دہلی کی گلیوں کا چکّر لگاتے، کبھی کبھی کشمیری دروازے کی طرف بھی نکل جاتے۔ ایک روز جو کشمیری دروازے کی طرف گیا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ دہلی کالج میں بڑا ہجوم ہے۔ کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ اسکول ہے۔ میں بھی بھیڑ میں گھس گیا۔ معلوم ہوا کہ لڑکوں کا امتحان لینے مُفتی صدر الدّین صاحب آئے ہوئے

ہیں۔ ہم نے کہا چلو ہم بھی دیکھیں۔ برآمدے میں پہنچا۔ قد چھوٹا تھا، لوگوں کی ٹانگوں میں سے ہوتا ہوا، گھس گھسا کر کمرے کے دروازے تک پہنچ ہی گیا۔ دیکھا کہ کمرے کے بیچ میں میز بچھی ہے، اُس کے سامنے کرسی پر مُفتی صاحب بیٹھے ہیں۔ ایک ایک لڑکا آتا ہے، اُس سے سوال کرتے ہیں اور سامنے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے ہیں۔ میز کے دوسرے پہلو کی کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے، یہ مدرسے کے پرنسپل صاحب تھے۔

تماشے میں محو تھا کہ صاحب کسی کام کے لیے اُٹھے، چپراسیوں نے رستہ صاف کرنا شروع کیا۔ جو لوگ دروازہ رُو کے کھڑے تھے، وہ کسی طرح پیچھے نہ ہٹتے تھے، چپراسی زبردستی ڈھکیل رہے تھے، غرض اِس دھکا پیل میں میرا اقلیہ ہوگیا۔ دروازے کے سامنے سنگِ مرمر کا فرش تھا، اُس پر سے میرا پانو رپٹا اور میں دھم سے گرا۔ اِتنی دیر میں پرنسپل صاحب بھی دروازے تک آگئے تھے۔ اُنھوں نے جو مجھے گرتے دیکھا، تو دوڑ کر میری طرف بڑھے، مجھے اُٹھایا، پوچھتے رہے کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔ اُن کی شفقت آمیز باتیں اب تک میرے دل پر کالنقش فی الحجر ہیں۔ باتوں باتوں ہی میں پوچھا: میاں صاحب زادے کیا پڑھتے ہو؟ میں نے کہا: مُعلّقات۔ اُن کو بڑا تعجب ہوا۔ پھر پوچھا، میں نے پھر وہی جواب دیا۔ میری عُمر پوچھی۔ میں نے کہا: مجھے کیا معلوم۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ، بجائے اپنے کام کو جانے کے سیدھا مجھ کو مفتی صاحب کے پاس لے گئے اور کہنے لگے: مُفتی صاحب! یہ لڑکا کہتا ہے میں مُعلّقات پڑھتا ہوں، ذرا دیکھیے تو سہی سچ کہتا ہے یا یوں ہی باتیں بناتا ہے۔ مُفتی صاحب نے کہا: تو کیا پڑھتا ہے؟ میں نے کہا: مُعلّقات۔ کہنے لگے: کہاں پڑھتا ہے؟ میں نے کہا: پنجابیوں کے کٹرے کی مسجد میں۔ پھر کہا: مُعلّقات دوں پڑھے گا؟ میں نے کہا لائیے۔ اُنھوں نے میز پر سے کتاب اُٹھائی، میرے ہاتھ میں دی اور کہا: یہاں سے پڑھ۔ جس شعر پر اُنھوں نے انگلی رکھی تھی، وہ یہی شعر تھا:

ابا هند فلا تعجل علینا   وانظرنا نخبرك الیقینا

میں نے پڑھا، معنی بیان کیے۔ اُنھوں نے ترکیب پوچھی، وہ بیان کی۔ میاں داتی! تمھاری طرح میں نے شعر نہیں پڑھا تھا اور میاں فرحت! تمھاری طرح ترکیب نہیں کی تھی [مولوی صاحب کا یہ اشارہ ہماری کم زوریوں کی طرف تھا، اِس کا ذِکر آیندہ آئے گا] مُفتی صاحب بہت چکرائے، پوچھنے لگے: تجھ کو کون پڑھاتا ہے؟ میں نے کہا: مسجد کے مولوی صاحب۔ کہا: مدرسے میں پڑھے گا؟ میں نے جواب دیا: ضرور پڑھوں گا۔ مُفتی صاحب نے قلم اُٹھایا کاغذ پر چند سطریں لکھیں اور پرنسپل صاحب کو دے کر کہا: اِس کو پریسیڈنٹ صاحب کے پاس پیش کر دینا۔ ہم وہاں سے نکل اپنے گھر آئے، مولوی صاحب سے کچھ نہ کہا۔

کوئی سات آٹھ روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس آ ایک کاغذ دے گیا، اُس میں لکھا تھا کہ نذیر احمد کو کالج میں داخل کرنے کی اجازت ہوگئی ہے، کل سے آپ اُس کو کالج میں آنے کی ہدایت کر دیجیے، اُس کا وظیفہ بھی ہوگیا ہے۔ چپراسی تو یہ حُکم دے چلتا بنا، مولوی صاحب نے مجھ کو بُلایا، خط دِکھایا، پوچھا: یہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ جب ذرا سختی کی، تو تمام واقعہ بیان کِیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور دوسرے رُوز لے جا میرا ہاتھ پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ اُس زمانے میں سیّد احمد خاں فارسی کی جماعت میں، منشی ذکاءاللہ حساب کی جماعت میں اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے، میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا۔ ایک تو شوق، دوسرے پڑھانے والے ہُشیار، تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا جس کا مجھے بچپن سے شوق تھا، تھوڑے ہی دنوں میں اپنی جماعت والوں میں سب کو دبالیا۔ اب جب کبھی یہ شعر پڑھتا ہوں، تو پہلا زمانہ یاد آجاتا ہے اور میں بے اِختیار ہنسنے لگتا ہوں۔ یہ کہتے ہی اُنھوں نے لہک لہک کر یہ شعر:

اباھند فلا تعجل علینا　　وانظرنا نخبرک الیقینا

پڑھنا اور ہنسنا شروع کِیا۔

میں نے کہا: مولوی صاحب! آپ کی جماعت کہاں بیٹھتی تھی؟ کہنے لگے: پرنسپل صاحب کے کمرے کے بازو میں جو چھوٹا کمرا ہے، اُس میں ہماری جماعت تھی۔ دوسرے پہلو میں جو کمرا ہے، اُس میں فارسی کی جماعت۔ داؔنی نے کہا: مولوی صاحب! آپ کے اختیاری مضمون کیا تھے؟ مولوی صاحب ہنسے اور کہا: میاں داؔنی! ہم پڑھتے تھے، آج کل کے طالب علموں کی طرح چوتڑوں سے گھاس نہیں کاٹتے تھے [مولوی صاحب اِس فقرے کا اکثر استعمال کیا کرتے تھے، معلوم نہیں کہاں کا مُحاورہ ہے] ارے بھئی! ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے۔ آج کل پڑھاتے نہیں، لادتے ہیں، آج پڑھا، کل بھولے۔ تمھاری تعلیم ایسی دیوار ہے جس میں گارے کا بھی رَدّا ہے، ٹھیکریاں بھی گھسیڑ دی گئی ہیں، مٹی بھی ہے، پتھر بھی ہے، کہیں کہیں چُونا اور اینٹ بھی ہے، ایک دھکّا دیا اور اَڑاڑ اَدھم گری۔ ہم کو اُس زمانے میں ایک مضمون پڑھاتے تھے، مگر اُس میں کامل کر دیتے تھے۔ پڑھانے والے بھی اَیرے غَیرے پچکلیان نہیں ہوتے تھے۔ ایسے ایسے کو چھانٹا جاتا تھا جن کے سامنے آج کل کے عالِم، محض کاٹھ کے اُلّو ہیں۔ اچھا بھئی اچھا آگے چلو:

بانّا نوردُ الرّایاتِ بیضا   وَنصدِرُھُنّ حُمراً قَد رَوِینا

میں نے کہا: مولوی صاحب! پہلے شعر کے معنی تو رہ ہی گئے۔ کہنے لگے: اِتنا بڑا قصّہ سُنا دیا اور اُس کے بعد بھی اِس شعر کے معنی کی ضرورت ہے۔ پس اِس کے یہی معنی ہیں کہ تحقیق ایک مُلّا کا بیٹا، ڈاکٹر، ڈپٹی، شمسُ العلماء، ایل۔ ایل۔ ڈی ہو گیا ساتھ آسانی کے، بیچ اِسی دِلّی کے، یہ وجہ اِس شعر کے۔

مولوی صاحب کی تعلیم کا حال سُن چکے، اب ہماری تعلیم کا حال سُنیے اور قصّے کو سراجُ الدّین صاحب کی دُکان کے واقعے کے دوسرے رُوز سے لیجیے۔

میں اور میاں داؔنی ساڑھے گیارہ بجے مدرسے سے آئے، کھانا وانا کھایا، سبق کا مُطالعہ کیا اور ایک بجے نکل کھڑے ہوئے۔ مکان کا پتا پُوچھتے پُچھاتے ڈیڑھ میں پانچ منٹ تھے کہ مولوی صاحب کے دروازے پر جا دھمکے۔ دروازے

کی ایک چوکی پر میں اور دوسری پر میاں دانیؔ ڈٹ گئے۔ سامنے ہی کمرا تھا۔ بی چماری رسّی ہاتھ میں لیے اونگھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی رسّی کو ایک آدھ جھٹکا دے دیتی تھیں۔ کمرے کے اندر مولوی صاحب تھے، لیکن دروازہ بند تھا، اِس لیے دِکھائی نہ دیتے تھے۔ اب یہ خیال ہوا کہ یہ مولوی صاحب ہی کا مکان ہے یا کسی دوسرے کا! اندر زنانہ تو نہیں ہے! غرض اِس شش و پنج میں تھے کہ مولوی صاحب کے کمرے کے گھنٹے نے ٹن سے ڈیڑھ بجایا۔ ہم دونوں اُٹھے اور دبے پاؤں، چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے۔ گھر میں سنّاٹا تھا۔ بی چماری نے سر بھی اُٹھاکر نہ دیکھا کہ کون جارہا ہے۔ کمرے کا ایک دروازہ کھلا تھا، اُس میں گردن ڈال کر جھانکا۔ چوں کہ روشنی سے اندھیرے میں آئے تھے، اِس لیے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا: کون ہے؟ اِس آواز کو پہچان کر ہم تو سنبھل گئے، مگر بی چماری اُچھل پڑیں اور بے اِختیار اُن کے مُنہ سے گنبد کی آواز کی طرح نکلا: کون ہے؟ میں نے کہا: مَیں اور دانیؔ۔ مولوی صاحب نے کہا: آؤ بیٹا اندر آؤ۔ مولوی صاحب فوراً پلنگ پر اُٹھ بیٹھے اور تہمد کو سنبھالتے ہوئے نیچے اُتر آئے، پوچھا: کیا پڑھتے ہو؟ ہم نے کتاب پیش کی۔ تھوڑی دیر تک اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، اُس کے بعد کہا: بھئی ایک کتاب میرے لیے بھی لیتے آنا۔ ہم نے اپنی ایک کتاب اُن کو دے دی اور دوسری سے دونوں نے مِل کر کام نکالا۔ کب پڑھایا اور کس طرح پڑھایا، اُس کا میں آیندہ ذکر کروں گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب پڑھ کر اُٹھے، تو سب کچھ یاد تھا، مگر دماغ پر کسی قسم کا بار نہ تھا۔ خوشی خوشی گھر آئے۔ چلو اللہ دے اور بندہ لے۔

ہم نے بھی کالج میں مولوی صاحب کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔ یہاں تک کہ یہ آواز ہندو کالج کے طلبہ کے کان تک پہنچی۔ وہاں کے ایک طالبِ علم مسٹر رضاؔ کے دل میں گُدگُدی اُٹھی، وہ آئے، ہم سے ملے اور کہا: بھئی میں بھی تمھارے ساتھ چلوں، مولوی صاحب انکار تو نہ کریں گے؟ ہم نے کہا: چلو اور ضرور چلو، مولوی صاحب کا کیا بگڑتا ہے، دو کو نہ پڑھایا تین کو پڑھایا۔ اُنھوں نے کہا: نہیں، پہلے

مولوی صاحب سے پوچھ لُو۔ ہم نے کہا: یار چلو بھی، اگر اُنھوں نے کچھ کہا، تو ہمارا ذِمّہ۔ وہ راضی نہ ہوئے اور یہی کہا کہ پہلے پوچھ لُو۔ اِس عرصے میں ہماری ہمّت مولوی صاحب کے سامنے بہت بڑھ گئی تھی، دوسرے دن جاتے ہی رضا کا ذِکر کیا۔ اُنھوں نے کہا: لیتے کیوں نہ آئے۔ ہم نے کہا: وہ ذرا شرمیلے ہیں، بغیر اجازت نہیں چاہتے۔ اُنھوں نے کہا: طالبِ علم شرمیلا ہوا اور ڈوبا۔ خَیر کل ضرور ساتھ لانا، ذرا اُن کا بھی رنگ دیکھ لوں۔ شام کو واپسی کے وقت جاتے جاتے فراش خانے میں ہم نے رضا کو مولوی صاحب کا اجازت نامہ پہنچا دیا اور کہہ دیا کہ بھئی پورے ڈیڑھ بجے پہنچ جانا، ورنہ اندر گھُسنا نہ ملے گا۔ دوسرے دن جب ہم پہنچے، تو وہ پہلے ہی سے دروازے پر ڈھئی دِیے بیٹھے تھے۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے ہم اندر داخل ہوئے۔ مولوی صاحب ہم کو دیکھتے ہی پلنگ پر اُٹھ بیٹھے اور کہا: لاؤ کِتاب۔ ہم نے کتاب طاق پر سے اُتار اُن کے ہاتھ میں دی اور وہ کتاب لیتے لیتے نیچے آ بیٹھے اور کہا: اچھّا یہ ہیں میاں رضا! بےچارے رضا نے گردن جھکا کر کہا: جی ہاں۔ مولوی صاحب نے کہا: اچھا بھئی شروع کرو۔

ہمارے پڑھنے کا یہ طریقہ تھا کہ ایک رُوز مَیں پڑھتا تھا، دوسرے رُوز میاں دانی، اب اِس کو ہماری شرارت کہو یا محض اِتّفاق، ہم دونوں چُپکے بیٹھے رہے۔ جب اِس خاموشی نے طوُل کھینچا، تو مولوی صاحب نے کہا: ارے بھئی آج تم پڑھتے کیوں نہیں؟ کیا مُنہ میں گھنگنیاں بھر کر آئے ہو؟ اچھّا میاں رضا! تم ہی شروع کرو۔ رضا نے صفحہ پوچھا اور پڑھنا شروع کیا، اگر اِعراب کی غلطیاں مجھ سے کم کیں، تو نظم کو نثر میاں دانی سے زیادہ بنا دیا۔ ایک آدھ شعر تک تو مولوی صاحب چُپکے سُنتے رہے، اُس کے بعد کہنے لگے: واہ بھئی واہ! ہم کو بھی عجب نمونے کے شاگرد ملے ہیں۔ میاں رضا! اگر ہم تم کو ایک نیک صَلاح دِیں، تو مانو گے؟ رضا نے نہایت شرمیلی آواز میں، گردن جُھکا کر کہا: بہ سَر و چشم۔ مولوی صاحب نے کہا: دیکھو اپنے وعدے سے پھر نہ جانا! اُنھوں نے کہا: جی نہیں۔ مولوی صاحب

نے کہا: اچھا تو میری صلاح یہ ہے کہ کل سے تم میرے ہاں نہ آنا ۔ یہ سُن کر وہ بچارے کچھ بِتر مُردہ سے ہو گئے ۔ مولوی صاحب نے کہا: بھئی رضا ! میں یہ نہیں کہتا کہ میرے ہاں آنا ہی چھوڑ دو ، میں تم کو بھی ضرور پڑھاؤں گا ، مگر تم دس پندرہ رُوز شام کے وقت کالی جان کے ہاں تعلیم میں ہو آیا کرو ۔ اِتنے دنوں کے آنے جانے میں تمھارے کانوں کو نظم اور نثر کا فرق معلوم ہونے لگے گا ۔ بھئی مجھ سے تو شعروں کے گلے پر چھُری پھیرتے دیکھا نہیں جاتا ۔ بے چارے مُتنبّی کو کیا خبر تھی کہ بتاشوں کی گلی میں، نذیر احمد کے کمرے میں ، اُس کے اشعار مولوی رضا صاحب اِس طرح حلال کریں گے ۔ بچارے رضا کے سر پر گھڑوں پانی پڑ گیا ۔ خُدا خُدا کر کے سبق خَتم ہوا اور ہم سب رُخصت ہوئے ۔ راستے میں ہم نے اُن کو بہت بنایا ۔ دوسرے رُوز سے وہ ایسے غائب ہوئے کہ پھر شکل نہ دِکھائی ۔

مسٹر رضا کی حیا کا حال تو سُن چکے ، اب ہماری بے حیائی کی داستان سُنیے ۔ میری صَرف و نحو بہت کم زُور تھی ، اور کم زُور کیوں نہ ہوتی ، شروع کیے ہوئے کَے دِن ہوئے تھے ۔ اِعراب میں ہمیشہ غلطی کرتا تھا ۔ نثر کو تو سنبھال لیتا تھا ، مگر نَظم میں دِقّت پڑتی تھی ۔ شعر خود بھی کہتا تھا ، دوسروں کے ہزاروں شعر یاد تھے ، اِس لیے شعر کو تقطیع سے گرنے نہ دیتا تھا ۔ میاں داتی کی حالت اِس کے بالکل بَرعَکس تھی ، وہ اِعراب کی غلطی نہ کرتے تھے ، مگر شعر کو نثر کر دیتے تھے ۔ سکتے تو کیا ، جھٹکے پڑ جاتے تھے ۔ مولوی صاحب ہم دونوں کے پڑھنے سے بہت جِز بِز ہوتے تھے ۔

ایک دِن یہ ہوا کہ میرے پڑھنے کی باری تھی ۔ میں نے ایک شعر پڑھا ، معلوم نہیں کہاں کے اِعراب کہاں لگا گیا ۔ مولوی صاحب نے کہا: ہیں ! کیا پڑھا! میں سمجھا کہ اِعراب میں کہیں غلطی ضرور ہوئی ۔ تمام اِعراب بدل کر شعر موزوں کر دیا ۔ اُنھوں نے پھر بڑے زُور سے "ہوں" کی ۔ ہم نے پھر اِعراب بدل دیے ۔ اِس سے اُن کو غُصّہ آ گیا ، کہا: داتی ! تم تو پڑھو ۔ اُنھوں نے شعر کا گلا ہی گھونٹ دیا ، خاصے بھلے چنگے شعر کو نثر بنا دیا ۔ اب کیا تھا ، مولوی صاحب کا پارا ایک سو دس ڈگری پر چڑھ گیا ۔ کتاب اُٹھا کر جو پھینکی ، تو کمرے سے گزر ، دالان میں

ہوتی ہوئی صحن میں پہنچی اور نہایت غُصیلی آواز میں کہا: نکل جاؤ، ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ۔ نہ تم مجھ سے پڑھنے کے قابل ہو اور نہ میں تمھارے پڑھانے کے لائق۔ داتی نے میری طرف دیکھا، میں نے داتی کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا: چلو۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا: ہرگز نہیں۔ اُنھوں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا، میں نے اُن کا زانو دبایا۔ مولوی صاحب کی یہ حالت تھی کہ شیر کی طرح بپھر رہے تھے۔

آخر جب دیکھا کہ یہ لونڈے ٹس سے مس نہیں ہوتے، تو کہنے لگے کہ اب جاتے ہو یا نہیں! میں نے کہا: مولوی صاحب! جب تک کوئی دھکّے دے کر نہ نکالے گا، اُس وقت تک تو ہم جاتے نہیں اور جائیں گے، تو ابھی پھر آجائیں گے۔ مولوی صاحب نے جو یہ بے حیائی دیکھی، تو ذرا نرم ہوئے، کہنے لگے: اچھّا نہیں جاتے ہو تو نہ جاؤ، مگر میں ایک حرف تم کو نہ پڑھاؤں گا۔ میں نے کہا: نہ پڑھائیے، مگر بغیر پڑھے ہم یہاں سے نہ ٹلے ہیں نہ ٹلیں گے۔ کہنے لگے: بیٹا! اِس وقت میری طبیعت خراب ہوگئی ہے، اب چلے جاؤ، کل آجانا۔ داتی نے سچ جانا۔ بس سمجھا کہ اِس وقت اُٹھے اور مولوی صاحب ہاتھ سے گئے۔ داتی اُٹھ کھڑے ہوئے، میں نے پکڑ کر اُن کو بِٹھالیا۔ مولوی صاحب یہ تماشا دیکھتے رہے۔ میں نے کہا: مولوی صاحب! پڑھیں گے تو آج پڑھیں گے، اور آج پڑھیں گے تو اِس وقت پڑھیں گے۔ پڑھانا ہے تو پڑھائیے، ورنہ ہم یہاں سے نہ جانا ہے نہ جائیں گے۔ آخر کار ہم جیتے اور مولوی صاحب ہارے، کہنے لگے: خُدا محفوظ رکھے! تم جیسے شاگرد بھی کسی کے نہ ہوں گے۔ شاگرد کیا ہوئے، اُستاد کے استاد ہو گئے۔ اچھّا بھئی میں ہارا، میں ہارا۔ اچھّا خُدا کے لیے کتاب اُٹھالاؤ اور سبق پڑھ کر میرا پنڈ چھوڑو۔ دیکھیے کون سا دن ہوتا ہے کہ میرا تم سے چھُٹکارا ہوتا ہے۔ میں جا کر صحن میں سے کتاب اُٹھالایا اور مولوی صاحب جیسے تھے، ویسے کے ویسے ہوگئے۔ کہا کرتے تھے کہ اگر اُس دن تم چلے جاتے، تو میرے گھر میں گھُسنا نصیب نہ ہوتا۔ میں

تمھارے شوق کو آزماتا تھا، مگر تم نے مجھے ہی آزما ڈالا۔ خدا ایسے شاگرد سب کو نصیب کرے۔ یہ بے حیائی نہیں، میاں یہ شوق ہے! علم کا جس کو چسکا ہوتا ہے، وہ بُری بھلی سب ہی کچھ سُنتا ہے۔ بدشوق بھاگ نکلتے ہیں اور شوقین استاد کو دبا لیتے ہیں۔

پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم میں سے کسی نے کتاب میں سے ایک شعر پڑھا اور مولوی صاحب نے کتاب اُلٹ کر میز پر رکھ دی۔ پہلے دانیؔ کی طرف مُتوجّہ ہوے اور صَرف و نَحو کے نِکات پر بحث شروع ہوئی۔ اِس بحث میں مجھے بارہ پتھر باہر سمجھ لیا جاتا تھا۔ کبھی میں نے دخل بھی دیا، تو مولوی صاحب نے فرمایا: آپ مہربانی کر کے اِس بارے میں اپنے دماغ پر زور ڈالنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیے۔ اِس کے بعد معنی بیان کیے، نِکات بتائے اور پھر اُسی مضمون کے شعر اور مَقولوں کا سلسلہ چھڑا۔ اب میاں دانیؔ خارج از بحث ہو گئے۔ اوّل تو مجھے یوں ہی ہزاروں شعر یاد تھے، دوسرے خاص طور پر تیار ہو کر جاتا تھا۔ مولوی صاحب اگر ایک شعر پڑھتے، تو میں دو پڑھنے کو تیار ہو جاتا۔ جب فریقین اپنا ہندستانی گولہ بارود ختم کر چکتے، تو یورپ اور انگلستان کے شُعرا اور فلسفیوں کے مقولوں کا نمبر آتا، اِس میں دانیؔ بھی شریک ہو جاتے۔ اگر کوئی قصّہ طلب شعر ہوا اور اُسی قسم کا کوئی ماجرا مولوی صاحب پر گزرا تھا، تو اُس قصّے کے ساتھ اپنا قصّہ بھی ضرور بیان کر دیتے۔ غَرَض ایک شعر کی تشریح میں آدھ آدھ گھنٹا گزر جاتا، مگر اُس کے بعد جو وہ شعر ذہن نشیں ہوتا، تو اُس کا محو ہونا مشکل تھا، چُناں چہ اب تک مجھے اکثر شعر یاد ہیں۔

اگر کوئی رزمیہ قصیدہ ہوا، تو اُس سلسلے میں اکثر غدر کے حالات بیان کرتے اور جو کچھ شُرفاے دہلی پر اُس طوفانِ بے تمیزی میں گزری تھی، اُس کی داستان نہایت دردناک الفاظ میں سُناتے۔ اکثر کہا کرتے: میاں! بِچارا بہادر شاہ مجبور تھا۔ کس اور پر اگر یہی مصیبت نازِل ہوتی، تو وہ بھی اِسی طرح اُن بدمعاش تلنگوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا۔ یہ لوگ کوئی بادشاہ کو فائدہ پہنچانے تھوڑی آئے تھے،

اُن کا مقصد تو شہر لوٹنا تھا، وہ پورا ہوا اور اُنھوں نے دہلی کو کھک کر دیا۔ ایک رُوز مَیں دریبے میں سے جا رہا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوج کی فوج تِلنگوں کی آ رہی ہے۔ مَیں بھی دبک کر گلاب گندھی کی دُکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آگے آگے بینڈ والے تھے، مگر وہ ایسا اندھا دُھند ڈھول ٹھونک رہے تھے کہ خُدا کی پناہ! پیچھے کوئی پچاس ساٹھ سوار تھے، مگر اُن کی عجیب کیفیت تھی۔ گھوڑے کیا تھے، دُھوبی کے گدھے معلوم ہوتے تھے۔ بیچ میں سوار تھے، مگر گٹھریوں کی کثرت سے جسم کا کچھ تھوڑا ہی حصّہ دِکھائی دیتا تھا۔ یہ گٹھریاں کیا تھیں؟ دہلی کی لوٹ، جس بھلے آدمی کو کھاتا پیتا دیکھا، اُس کے کپڑے تک اُتروا لیے۔ جس روپے پیسے والے کو دیکھا، اُس کے گھر پر جا کر ڈھئی دے دی اور کہا: چل ہمارے ساتھ قلعے کو، تو انگریزوں سے مِلا ہوا ہے۔ جب تک کچھ رکھوا نہ لیا، اُس کا پنڈ نہ چھوڑا۔ اگر دہلی کے چاروں طرف انگریزی فوج کا مُحاصرہ نہ ہوتا، تو شریف لوگ کبھی کے دہلی سے نکل گئے ہوتے۔

غرض خُدائی فوج داروں کا یہ لشکر غُل مچاتا، دین دین کے نعرے مارتا میرے سامنے سے گُزرا۔ اُس جمِّ غفیر کے بیچوں بیچ دولھا میاں تھے۔ یہ کون تھے، عالی جناب بہادُر خاں صاحب سپہ سالار۔ لباس سے بجائے سپہ سالار کے دولھا معلوم ہوتے تھے، ہَرّا اَور زیور میں لدے ہوئے تھے۔ پہنتے وقت شاید یہ بھی معلوم کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی تھی کہ کون سا مردانہ زیور ہے اور کون سا زنانہ۔ صافے پر بجائے طُرّے کے، سَراَسَری لگائی تھی۔ جیسے خود زیور سے آراستہ تھے، اُسی طرح اُن کا گھوڑا بھی زیور سے لدا ہوا تھا۔ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا، نعوذ باللہ، خُدا کی خُدائی اب اِن کے ہی ہاتھ آ گئی ہے۔ گُلاب گندھی نے جو اِن لُٹیروں کو آتے دیکھا، چُپکے سے دُکان بند کر دی اور اندر دروازوں سے بیٹھا جھانکتا رہا۔ خُدا معلوم کیا اِتّفاق ہوا کہ بہادر خاں کا گھوڑا عین اُس کی دُکان کے سامنے آ کر رُکا۔ بہادر خاں نے اِدھر اُدھر گردن

پھیری، پوچھا: یہ کس کی دُکان ہے؟ اُن کے ایڈی کانگ نے عرض کی کہ گلاب گندھی کی۔ فرمایا: اُس بدمعاش کو خبر نہیں تھی کہ مابدولت اِدھر سے گزر رہے ہیں؟ دُکان بند کرنے کے کیا معنی، ابھی کھلواؤ۔ خبر نہیں، کہ اِس حُکمِ قضا شیم کا بچارے لالا جی پر اندر کیا اثر ہوا، ہم نے تو یہ دیکھا کہ ایک سپاہی نے تلوار کا دستہ کواڑ پر مار کر کہا کہ دروازہ کھولو، اور جس طرح "سم سم کھُل جا" کے الفاظ سے علی بابا کے قصّے میں چوروں کے خزانے کا دروازہ کھُلتا تھا، اُسی طرح اِس حُکمِ مُحکَم سے گُلاب گندھی کی دُکان کھُل گئی، بِجِنسِہٖ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تماشے کا پردہ اٹھ گیا۔ دروازے کے بیچوں بیچ لالا جی کانپتے، ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ کچھ بولنا چاہتے تھے، مگر زبان یاری نہ دیتی تھی۔ اُس وقت بہادر خاں کچھ خوش خوش تھے، شاید کسی موٹی اسامی کو مار کر آئے ہوں گے۔ کہنے لگے: تمھاری ہی دُکان سے بادشاہ کے ہاں عِطر جاتا ہے؟ لالا جی نے بڑے زور سے گردن کو ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح جھٹکا دیا۔ حُکم ہوا کہ جو عِطر بہتر سے بہتر ہو، وہ حاضر کرو۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اندر گئے۔ اور دو کُنٹر عِطر سے بھرے ہوئے حاضر کیے۔ معلوم نہیں بیس روپے تولے کا عِطر تھا یا تیس روپے تولے کا۔ بہادر خاں نے دونوں کُنٹر لیے، کاگ نکالنے کی تکلیف کون گوارا کرتا، ایک کی گردن دوسرے سے ٹکرا دی، دونوں گردنیں کھٹ سے ٹوٹ گئیں۔ عِطر سونگھا، کچھ پسند آیا، ایک کُنٹر گھوڑے کی آیال پر اُلٹ دیا اور دوسرا دُم پر۔ کُنٹر پھینک حُکم دیا گیا: فارورڈ، اور اِس طرح بچارے گُلاب گندھی کا سیکڑوں روپے کا نقصان کر کے، یہ ہندستان کو آزادی دِلانے والے چل دیے۔ اُدھر اُس خُدائی فوج دار کا جانا، اِدھر ہم لونڈوں کا تالیاں بجانا، بچارے لالا جی نے کھسیانے ہو کر دُکان بند کر دی۔

بھئی غدر کے طوفانِ بے تمیزی میں نقصان تو جو ہونا تھا، وہ ہوا، مگر کالج کی دوربین توڑ کر، جو نقصان اُس بے سَری فوج نے ملک کو پہنچایا، اُس کی تلافی ناممکن ہے۔ کالج میں پرنسپل صاحب کے کمرے کے اُوپر ایک بڑی زبردست

دوربین نصب تھی۔ پرنسپل صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ دوربین کالج کے ایک بڑے دل دادہ انگریز نے کالج کی نذر کی ہے۔ اُس کا سامنے کا شیشہ بڑی دِقّت سے تیار ہوا تھا۔ اُس انگریز کے خاندان والوں نے برسوں میں اُسے گِھس کر پتلا اور اتنا پتلا کیا تھا کہ کاغذ سے بھی باریک ہو گیا تھا۔ غرض کہ یہ دوربین کالج کا سرمایۂ ناز تھی۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوٹھے پر ایک بڑی توپ لگی ہوئی ہے۔ غدر کے زمانے میں کسی بدمعاش کی اُس پر بھی نظر پڑ گئی، اُس نے جا کر فوج میں اُڑا دیا کہ انگریزوں نے راتوں رات کشمیری دروازے سے آکر کالج کے اوپر توپ لگا دی ہے اور اب تھوڑی دیر میں قلعہ اُڑا دیں گے۔ یہ سُننا تھا کہ ساری فوج کالج پر چڑھ آئی، سیڑھیاں لگا، سیکڑوں سپاہی چھت پر پہنچ گئے۔ ایک کُندۂ ناتراش نے بندوق کا کُندا سامنے کے شیشے پر مارا، چھن سے شیشے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، اور ایک خاندان کی پچاس ساٹھ برس کی محنت خاک میں مِل گئی۔ اُن نابکاروں نے اِسی پر اکتفا نہیں کیا، دوربین کی دوربین اُٹھا نیچے پھینک دی اور چند ہی منٹ کے اندر، دین دین کے نعروں میں، اُس یادگارِ سلف کا اُن ناخلفوں کے ہاتھوں خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

غدر کے ہزاروں واقعات مولوی صاحب سے سُنے ہیں، لیکن اکثر تو ایسے ہیں کہ اُن کا، زمانۂ موجودہ میں دُہرانا خطرناک ہے اور بعض ایسے ہیں کہ وہ پوری طرح یاد نہیں رہے۔ ہم بی۔ اے میں پڑھتے تھے کہ کیمبرج سے غدر کے متعلق ایک جواب مضمون پر اِنعام مقرر ہوا۔ اُس مضمون کے لیے شرط یہ قائم کی گئی تھی کہ کوئی واقعہ تاریخی کتاب سے نہ لیا جائے، جو کچھ لکھا جائے، شہر کے بُڈّھے بُڑھیوں سے دریافت کر کے لکھا جائے۔ میں نے یہی مضمون لکھا تھا اور مجھی کو یہ اِنعام ملا۔ میں نے اُس مضمون میں ایک باب مولوی صاحب کے بیان کردہ قصّوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ میں کُرید کُرید کر مولوی صاحب سے اِس مضمون کے لیے واقعات دریافت کیا کرتا اور وہ خوشی خوشی بتاتے۔

اب وہ مضمون دریا بُرد نہیں، تو دریا پار ضرور ہوگیا۔ مُسَوَّدہ نہ رکھنا اور نہ رکھنے کی عادت ہے، اِس لیے اب اُس کا ذِکر کرنا ہی فُضول ہے۔

ہمارے پڑھنے کا طریقہ تو سُن چکے، اب مولویوں کی جماعت کا حال سُن لیجیے۔ اِس جماعت میں تمام کے تمام سرحد پار ہی کے لوگ تھے۔ لمبے لمبے کرتے، بڑی بڑی آستینیں، ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو تھان کی شلواریں، "شملہ بہ مقدارِ علم" کے لحاظ سے کئی کئی سیر کے پگڑ، لمبی لمبی داڑھیاں، غرض معلوم ہوتا تھا کہ افغانستان کا کوئی قطعہ اُٹھا کر بتاشوں کی گلی میں رکھ دیا ہے۔ محنت کی یہ حالت تھی کہ رات رات بھر کتاب دیکھتے۔ ٹھوٹھ ایسے کہ باوجود اِس محنت کے کورے کے کورے رہتے۔ مولوی صاحب ہمیشہ ہم سے اُن کی موٹی عقل کی تعریف کیا کرتے اور کہتے: بھئی مَیں اِن مُلّانوں سے عاجز آگیا ہوں، اپنا بھی وقت ضائع کرتے ہیں اور میرا بھی۔ جواب اِس لیے نہیں دے دیتا کہ دل شکنی ہوگی، مگر کیا کروں، اللہ میاں نے اِن کو ادب کے سمجھنے کا دماغ ہی نہیں دیا ہے۔ ہزار سمجھاتا ہوں، اِن کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ بھلا اِن کو حَماسہ یا مُتَنَبّی پڑھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ فوج میں نوکر ہو جائیں، محنت مزدوری کریں یا ہینگ کا توبڑا گلے میں ڈال کر بیچتے پھریں۔ ہم کہتے: مولوی صاحب! آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ رَگڑ سے پتّھر بھی گھس جاتا ہے۔ آخر مُتَنَبّی نے ایسے کون سے شعر کہے ہیں جو غور کرنے سے سمجھ میں نہ آئیں۔

ایک روز فرمانے لگے: لو آج تم ٹھہر جاؤ اور اِن مولویوں کا رنگ بھی دیکھ لو، مگر دیکھو، کہیں ہنس نہ دینا، ورنہ چُھرا ہی بھونک دیں گے۔ اُس روز ہم کو بھی چھُٹی تھی۔ ہم پڑھ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ یہ جماعت آگئی۔ یہ لوگ مولوی صاحب کو گھیر کر بیٹھ گئے اور ہم اُٹھ کر ایک کونے میں جا بیٹھے۔ اُس روز مقاماتِ حَریری کا سبق تھا۔ کتابیں کھولی گئیں اور ایک صاحب نے بڑی گرجتی ہوئی آواز میں اَعُوذُ بِاللہ سے سبق شروع کیا۔ زَید بن حارث کے

سفر کا حال تھا اور رات کے وقت سفر کرنے کو "فی اِناءِ اللّیل" سے ادا کیا تھا۔ اُن بھلے آدمیوں نے قاموس دیکھ کر مطالعہ کیا تھا، اُس میں شامتِ اعمال سے "اِناء" کے معنی مٹکے کے بھی ہیں، اللہ دے اور بندہ لے، اُنھوں نے یہاں مٹکا پھنسا دیا اور نہایت متانت سے "فی اِناءِ اللّیل" کے معنی "رات کے مٹکے میں سفر کیا" سے کر دیے۔ مولوی صاحب نے فرمایا: "اِناء" کے دوسرے معنی بھی تو ہیں۔ پڑھنے والے صاحب نے کہا: جی ہاں کئی معنی ہیں، لیکن اِس مقام پر "مٹکا" ہی زیادہ چسپاں ہوتا ہے۔ ہم کو ہنسی آئی، مولوی صاحب نے مسکرا کر اور اُن لوگوں نے نہایت بُرے بُرے دیدوں سے ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے سوچا: بھائی یہاں ہمارا ٹھکانا نہیں، یہاں سے کھسک جانا ہی مناسب ہے، کہیں کوئی اُٹھ کر گلا نہ گھونٹ دے۔ ہم نے اِجازت چاہی۔ مولوی صاحب کہتے ہی رہے کہ بیٹھو، ذرا اور کچھ سُن جاؤ، ہم نے کہا: مولوی صاحب! ہم کو کام ہے، کسی اور دن دیکھا جائے گا۔ یہ کہہ، جوتیاں پہن، سر پر پانو رکھ کر بھاگے۔ کوٹھے سے اُتر جو ہنسنا شروع کیا، تو گھر پہنچتے پہنچتے بڑی مشکل سے ہنسی رُکی۔ اب جب کبھی خیال آتا ہے، تو اُس جماعت کا نقشہ آنکھوں کے نیچے پھر جاتا ہے۔ اور رات کے مٹکے میں سفر کرنے کا فقرہ ہنساتا نہیں تو مسکراہٹ ضرور پیدا کر دیتا ہے۔

مولوی صاحب کو اپنے ترجمے پر ناز تھا اور اکثر اُس کا ذِکر فخریہ لہجے میں کیا کرتے تھے۔ اُردو ادب میں اُن کی جن تصنیفات نے دھوم مچا دی ہے، وہ اُن کے نزدیک بہت معمولی چیزیں تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میری تمام عُمر کا اصلی سرمایہ کلام مجید کا ترجمہ ہے۔ اِس میں مجھے جتنی محنت اُٹھانی پڑی ہے، اُس کا اندازہ کچھ مَیں ہی کر سکتا ہوں۔ ایک ایک لفظ کے ترجمے میں میرا سارا سارا دن صَرف ہو گیا ہے۔ میاں سچ کہنا، کیسا محاورے کی جگہ محاورہ بٹھایا ہے! ہم نے کہا: مولوی صاحب! بِٹھایا نہیں، ٹھونسا ہے۔ جہاں یہ فقرہ کہا اور مولوی صاحب

اُچھل پڑے۔ بڑے خفا ہوتے اور کہتے: کل کے لونڈو! میرے مُحاوروں کو غلط بتاتے ہو! میاں میری اُردو کا سِکّہ تمام ہندستان پر بیٹھا ہوا ہے، خود لکھو گے تو چیں بول جاؤ گے۔ مُحاورں کی بھرمار کے متعلق اکثر مجھ سے اُن کا جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ میں ہمیشہ کہا کرتا تھا: مولوی صاحب! آپ نے مُحاوروں کی کوئی فہرست تیار کر لی ہے اور کسی نہ کسی مُحاورے کو آپ کسی نہ کسی جگہ پھینسا دینا چاہتے ہیں، خواہ اُس کی گنجایش وہاں ہو یا نہ ہو۔ جنابِ والا! اہلِ زبان کو یہ دِکھانے کی ضرورت نہیں کہ وہ مُحاوروں پر حاوی ہے۔ یہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم باہر والے نہیں، دہلی والے ہیں۔ تھوڑی دیر تو حُجّت کرتے، اُس کے بعد کہتے: اچھا بھئی! تم ہی دہلی والے سہی۔ ہم تو اُسی طرح لکھیں گے جس طرح اب تک لکھا ہے۔ تم ہم کو دہلی والوں کی فہرست سے نکال دو، مگر میاں! اپنا ہی نقصان کرو گے۔

مجھ کو مولوی صاحب کے طرزِ تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے، کیوں کہ اوّل تو میرے لیے ابتدا ہی میں "خطاے بزرگاں گرفتن، خطاست" کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے۔ دوسرے میری قابلیت محدود کی سرحد سے گزر کر مفقود کی سرحد میں آ گئی ہے، لیکن باوجود اِن موانعات کے میں نے مولوی صاحب کے سامنے یہی کہا، اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ مُحاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا۔ تحریر میں ہو یا تقریر میں، وہ مُحاوروں کی ٹھونسم ٹھانس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے، اور بعض وقت ایسے مُحاورے اِستعمال کر جاتے تھے، جو بے موقع ہی نہیں، اکثر غلط ہوتے تھے۔ خُدا معلوم اُنھوں نے مُحاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا! ایسے ایسے مُحاورے اُن کی زبان اور قلم سے نکل جاتے تھے جو نہ کبھی دیکھے نہ سُنے۔ اُن کی عِبارت کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ مِلنا مشکل ہے، مگر چلتے چلتے راستے میں عربی الفاظ کے رُوڑے ہی نہیں

بچھاتے تھے، بلکہ پہاڑ رکھ دیتے تھے۔ غرض یہ تھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ میں دہلی والا ہی نہیں ہوں، مولوی بھی ہوں۔ بہ ہر حال اُن کی تحریر کا ایک خاص رنگ ہے اور اُس کی نقل اُتارنا مشکل اور بہت مشکل ہے۔

ترجمہ کرنے کا اُنھیں خاص مَلکہ تھا، وجہ یہ تھی کہ کئی زبانوں پر حاوی تھے۔ اگر ایک زبان کے لفظ سے مطلب ادا نہ ہوا، تو دوسری زبان کا لفظ وہاں رکھ دیا۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ۱۹۰۳ء کے دربارِ تاج پوشی پر جو انگریزی کتاب لکھی گئی تھی، اُس کا ترجمہ مولوی صاحب کے سپرد ہوا۔ ایک رُوز جو ہم پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خوب صورت سی جلد کی ایک بڑی موٹی کتاب مولوی صاحب کی میز پر رکھی ہے۔ ہم نے اِجازت لے کر کتاب اُٹھائی اور اوّل سے آخر تک ساری تصویریں دیکھ ڈالیں۔ اوّل تو مولوی صاحب بیٹھے دیکھتے رہے، پھر کہنے لگے: بیٹا! یوں سرسری نظر سے کیا دیکھتے ہو، گھر لے جاؤ، اچھی طرح پڑھو، مگر دیکھو، خراب نہ کرنا۔ ہم دونوں نے دل میں سُوچا کہ خُدا معلوم یہ کیا بھید ہے جو مولوی صاحب بغیر مانگے اپنی کتاب دے رہے ہیں۔ خوش خوش کتاب بغل میں مار گھر آئے۔ دو ایک رُوز میں پڑھ ڈالی، ایک آدھ تصویر بھی غائب کر دی۔ چوتھے رُوز کتاب لے جا مولوی صاحب کے حوالے کی۔ پوچھا: کہو پسند آئی؟ ہم نے کہا: مولوی صاحب! خوب کتاب ہے۔ کہنے لگے: اچھی کتاب ہے تو ترجمہ کر ڈالو۔ ہم نے کورا جواب دے دیا۔ کہا: دیکھو، سنو، اِس کتاب کا ترجمہ مجھے کرنا ہے، تم سے ترجمہ کراؤں گا، صحیح میں کر دوں گا۔ اب مجھ میں اِتنا دَم نہیں کہ اِتنی بڑی کتاب کا ترجمہ کر سکوں۔ اگر اب کے اِنکار کیا، تو کل سے گھر میں گھسنے نہ دوں گا۔ یہ کہتے کہتے، کتاب کی جِلد توڑ، دس صفحے میرے اور دس میاں دانی کے حوالے کر دیے۔ ساتھ ہی میاں رحیم بخش کو آواز دی۔ وہ آئے، اُن کو حکم دیا کہ ایک ایک دستہ بادامی کاغذ کا اِن دونوں کو دے دو۔ "قہرِ درویش بر جانِ درویش" کی صورت تھی۔ جس طرح پہلے خوشی خوشی پوری کتاب لے گئے تھے، اُسی طرح مُنہ

بنائے ہوئے اُن پُلندوں کو بغل میں مارا۔ گھر آکر، بے گار کے کام کی طرح ترجمہ کیا۔ دوسرے روز جاکر پڑھنے کے لیے کتاب اُٹھائی، پوچھا: ترجمہ لائے؟ ہم نے دبی ہوئی آواز میں کہا: لائے۔ کہا: پہلے وہ پڑھو۔ ہم پڑھتے جاتے اور مولوی صاحب، اَصل کتاب دیکھ کر، اُس کی دُرستی کرتے جاتے۔ اب اگر مَیں یا دانیؔ کہیں کہ یہ ترجمہ ہمارا ہے، تو یقین مانیے کہ دونوں جھوٹے ہیں۔

مولوی صاحب کی اِصلاح نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم نے سمجھ لیا کہ اِس علم میں بھی مولوی صاحب سے بہت کچھ حاصل کِیا جا سکتا ہے۔ اُس کے بعد سے ہمیں ترجمے کا شوق ہو گیا اور تھوڑے ہی دِنوں میں کتاب ختم ہو گئی۔ اُس کے چھپنے کے بعد ہماری مولوی صاحب سے بڑی جنگ ہوئی، کیوں کہ بندۂ خدا نے ہم دونوں غریبوں کا اُس میں ذرا بھی ذِکر نہیں کِیا، مگر کچھ پروا نہیں، اُس کا بدلا ہم اب لیے لیتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ اُس کتاب میں تھوڑے بہت لفظ ہم دونوں کے بھی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر اِصلاح شدہ مُسوّدوں کو دیکھا جائے، تو کاٹ چھانٹ کی وجہ سے ہمارے لفظوں کا تلاش کرنا، سر میں لیکھیں دیکھنے سے کم مشکل نہ ہو گا۔

ہاں تو مَیں یہ کہہ رہا تھا کہ مولوی صاحب چوں کہ کئی زبانوں پر حاوی تھے، اِس لیے اُن کو کہیں نہ کہیں سے مناسب لفظ ادائے مطلب کے لیے ضرور مل جاتا تھا۔ مثلاً اُسی جشنِ تاج پوشی کی کتاب میں ایک جگہ لفظ Stallion آیا۔ ڈکشنری میں جو دیکھا تو اِس کے معنی ”سیاہ بڑا جنگی گھوڑا“ نکلے، یاروں نے ترجمے میں وہی لفظ ٹھونک دِیے۔ جب مولوی صاحب نے یہ الفاظ سُنے تو بہت ہنسے، کہنے لگے: واہ بیٹا واہ! کیوں نہ ہو دہلیؔ والے ہو۔ خالص اُردو لکھی ہے، بندۂ خُدا! ”شبدیز“ لکھ دو، چلو چھٹی ہوئی۔ اب کوئی صاحب اِس سے بہتر لفظ بتا دیں تو مَیں جانوں۔ اُن کے ترجمے میں خوبی یہ ہوتی تھی کہ لفظ کی جگہ لفظ بِٹھاتے تھے، لیکن وہ لفظ ایسا ہوتا تھا کہ وہاں نگینہ بن جاتا تھا۔

"تعزیراتِ ہند" کا ترجمہ اُٹھا کر دیکھو، وہی لفظ بہ لفظ ہے، معنی بھی پورے دیتا ہے اور اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا۔ سیکڑوں کتابوں کے ترجمے ہوئے دوسری اشاعت میں کچھ اور تیسری میں کچھ کے کچھ ہو گئے، لیکن "تعزیراتِ ہند" کا ترجمہ جوں کا توں ہے، ایک لفظ اِدھر سے اُدھر نہیں ہوا۔

کہا کرتے تھے کہ "تعزیراتِ ہند" کا ترجمہ بھی میرا ایک کارنامہ ہے۔ اِس کتاب کے ترجمے کا کام تین آدمیوں کے سپرد ہوا تھا، اُن میں ایک مولوی عظمت اللہ صاحب تھے۔ اُس کی اصلاح ڈائرکٹر صاحب کے ذمّے تھی اور ہم ڈائرکٹر صاحب کے سَررِشتے دار تھے۔ رُوزانہ ایک دو دفعات کا ترجمہ آتا، ہم ڈائرکٹر صاحب کو سُناتے۔ وہ بڑا غُل مچاتے کہ یہ لفظ خلافِ مُحاورہ ہے، اِس لفظ سے مَفہوم ادا نہیں ہوتا، یہ لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا گیا ہے۔ غرض دو تین دَفعات کہیں تین چار گھنٹے میں پاس ہوتیں۔ مجھے بڑا تاؤ آتا تھا کہ ترجمہ کرے کوئی، یہ باتیں سُنے کوئی، مگر بھئی یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بھی آدمی جو بات کہتا تھا، باون تُولے پاؤ رَتّی کی کہتا تھا۔ جو اِعتراض کرتا تھا وہ اُٹھائے نہ اُٹھتا تھا۔ میاں! پُرانے زمانے کے انگریز غضب کی اُردو سمجھتے تھے۔ گو اچھی اُردو لکھ نہ سکیں، مگر ترجمے کی وہ وہ غلطیاں نکالتے تھے کہ تم جیسے دہلی والوں کے کان پکڑوا دیں۔

میں بھی ترجمہ دیکھتا تو واقعی کچھ اُکھڑا اُکھڑا معلوم ہوتا تھا، میں نے دل میں کہا کہ نذیر احمد! تو بھی خم ٹھونک کر میدان میں کیوں نہیں آجاتا اُردو جانتا ہے، فارسی جانتا ہے، عربی جانتا ہے، کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سمجھتا ہے، اِن لوگوں سے اچھا نہیں تو کم سے کم ایسا ترجمہ تو تو بھی کرے گا۔ یہ سُوچ سَوا روپے کی رائل ڈکشنری بازار سے خرید لایا، رات کو لمپ جلا، کپڑے اُتار لنگوٹ باندھ ترجمے پر پل پڑا۔ جن دَفعات کا ترجمہ دوسرے روز پیش ہونے والا تھا، اُن کا خود ترجمہ کر ڈالا۔ دوسرے دن ترجمہ جیب میں ڈال دفتر پہنچا

ڈائرکٹر صاحب آئے ، مجھے بلایا اور اُن لوگوں کے ترجمے کو سُن کر وہی گڑبڑ شروع کی۔ خُدا خُدا کر کے یہ مشکل آسان ہوئی ، میں نے کہا کہ کم ترین بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ کہا: اچھّا، کہو۔ میں نے جیب میں سے کاغذ نکالا۔ وہ سمجھے عرضی ہے ، لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ میں نے کہا: عرضی نہیں ، آج کی دَفعات کا ترجمہ میں نے کیا ہے۔ ڈائرکٹر صاحب یہ سُن کر اُچھل پڑے ، کہنے لگے: تم نے! تم نے ترجمہ کیا ہے! تم کو تو انگریزی نہیں آتی ، پھر ترجمہ کیسے کیا؟ میں نے کہا: رائل ڈکشنری سے۔ اُنھوں نے ہنس کر کہا: "تعزیراتِ ہند" کا ترجمہ رائل ڈکشنری سے نہیں ہوا کرتا۔ میں نے کہا: سُن تو لیجیے۔ کہا: اچھّا سُناؤ۔ میں نے جو پڑھا تو صاحب بہادر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کہنے لگے: یہ ترجمہ تم نے رائل ڈکشنری سے کیا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ کہنے لگے: کل شروع کی چار دَفعات کا ترجمہ کر کے لاؤ۔ میں دوسرے دن لے کر گیا۔ بہت پسند کیا اور کہا: تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہا کہ مَیں ترجمہ کر سکتا ہوں ، جو میرا اِتنا وقت ضائع کرایا ، جاؤ تم بھی اُن ترجمہ کرنے والوں میں شریک ہو جاؤ۔ اُس دن سے ہم بھی پانچوں سواروں میں مِل گئے اور یہی ہماری ترقّی کا زینہ تھا۔

اب رہے ہماری تصنیفات پر انعام ، وہ تو اللہ میاں نے چھپّر پھاڑ کر دِیے ہیں۔ اگر کوئی کہتا بھی کہ مِراۃُ العَروس پر تم کو انعام ملے گا ، تو میں اُس کو دیوانہ سمجھتا۔ اَصل یہ ہے کہ یہ کتاب میں نے اپنی لڑکی کے لیے لکھی تھی ، وہی پڑھا کرتی تھی۔ میاں بشیر کو چند بند لکھ کر دی تھی۔ میں اُس زمانے میں تعلیمات کا انسپکٹر تھا۔ دَورے پر نکلے تھے ، بال بچّے ساتھ تھے ، ایک جگہ ٹھہرے تھے کہ مسٹر کیمپ سن ڈائرکٹر تعلیمات کا ڈیرا بھی قریب میں آ لگا۔ شام کا وقت تھا ، میاں بشیر اپنی ٹٹوانی پر سوار ہو کر ہَوا خوری کو نکلے۔ اُدھر سے ڈائرکٹر صاحب آ رہے تھے ، میاں بشیر نے جُھک کر سلام کیا۔ صاحب ٹھہر گئے ، پوچھا: میاں تمھارا کیا نام ہے؟ اُنھوں نے نام بتایا۔ پھر پوچھا: تمھارے والد کون ہیں؟ اُنھوں نے میرا نام بتایا۔ پھر پوچھا:

کہو میاں کیا پڑھتے ہو؟ اُنھوں نے کہا: چند پند۔ ڈائرکٹر صاحب سمجھے تھے کہ اُردو کی پہلی یا دوسری کہے گا۔ چند پند کا نام سُن کر پریشان ہوئے، کیوں کہ اِس عجیب وغریب نام سے اُن کے کان ناآشنا تھے، کہا: ہمیں اپنی کتاب دِکھاؤ گے؟ بشیر نے کہا: جی ہاں، ابھی لاتا ہوں۔ ہماری آپا کی بھی کتاب دیکھیے گا؟ اُنھوں نے کہا: اُس کتاب کا کیا نام ہے؟ اِنھوں نے کہا: مِرآۃُ العَرُوس۔ یہ دوسرا نیا نام تھا، صاحب نے کہا: ہاں وہ بھی لاؤ۔

میاں بشیر ٹٹوانی سے کود، بھاگتے ہوئے ڈیرے میں آئے، اپنا جُزدان کھول چند پند نکالی۔ اُس کے بعد اپنی بہن کے جُزدان پر قبضہ کیا۔ اُس نے جو دیکھا کہ بشیر جُزدان ٹٹول رہا ہے، تو دوڑی ہوئی گئی۔ اِتنے میں بشیر مِرآۃ العروس لے کر بھاگا، یہ اُس کے پیچھے بھاگی۔ دونوں میں بڑی دھینگا مُشتی ہوئی، خوب رُونا پیٹنا ہوا۔ بشیر بہن کو دَھکا دے، کتاب لے، یہ جا وہ جا۔ بہن صاحبہ نے دل کا بُخار آنسو بہا کر نکالا۔ میاں بشیر نے دونوں کتابیں لے جا صاحب کے حوالے کیں۔ اُنھوں نے اُلٹ پُلٹ کر کچھ پڑھا اور بشیر سے کہا: ہم یہ کتابیں لے جائیں، کل بھجوادیں گے۔ اِنھوں نے کہا: لے جائیے، کل ہم کو چھُٹّی رہے گی۔

میں جو ڈیرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قیامت مچ رہی ہے۔ لڑکی نے رُو رُو آنکھیں لال کر لی ہیں، میاں بشیر ڈرے سہمے ڈیرے کے ایک کونے میں دبکے بیٹھے ہیں۔ میرا اندر قدم رکھنا تھا کہ فریاد کی صدا بلند ہوئی۔ صاحب زادی نے رُو رُو کر اِس طرح واقعہ بیان کیا جس طرح کسی عزیز کے مرنے کا کوئی بَین کرتا ہے۔ میں نے بشیر کو بُلایا۔ وہ ڈرے کہ کہیں ٹھکائی نہ ہوجائے، پہلے ہی بِسورنا شروع کیا۔ وہ دبے جاتے تھے اور بہن شیر ہوئی جاتی تھی۔ آخر بڑی مشکل سے اِتنا معلوم ہوا کہ ایک انگریز دونوں کتابیں لے کر چلا گیا۔ میں نے جا کر سائیس سے پُوچھا کہ وہ انگریز کون تھا؟ تو معلوم ہوا کہ سامنے جو ڈیرے پڑے ہیں، اُن میں وہ اُترے ہیں۔ مجھے بڑا تعجّب ہوا کہ بھلا ڈائرکٹر صاحب کو بچّوں کی کتابوں سے کیا

کام! خیر، لڑکی کو دلاسا دِیا کہ میں لا دوں گا، نہیں تو دوسری لکھ دوں گا۔ اُس نے کہا کہ میں لوں گی تو وہی کتاب لوں گی۔ بڑی مشکل سے اُس کا غصّہ ٹھنڈا کیا۔ اب فکر ہوا کہ صاحب سے پوچھوں تو کیوں کر پوچھوں! سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ صاحب کا مطلب اِس طرح بچّوں کی کتابیں منگانے سے کیا ہو سکتا ہے! غرض اسی شش و پنج میں صبح ہو گئی۔ کوئی سات بجے ہوں گے کہ صاحب کا چپراسی آیا اور کہا کہ صاحب سلام بولتے ہیں۔ وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب بیٹھے مرآۃ العروس پڑھ رہے ہیں۔ سلام کر کے کُرسی پر بیٹھ گیا۔ صاحب نے کہا: مولوی صاحب! آپ نے ایسی مُفید اور دل چسپ کتابیں لکھیں اور طبع نہ کرائیں! اگر کل آپ کا لڑکا مجھ کو نہ ملتا، تو شاید کوئی بھی اِن کتابوں کو نہ دیکھتا اور چند ہی رُوز میں بچّوں کے ہاتھوں یہ کتابیں پھٹ پھٹا کر برابر ہو جاتیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں مرآۃ العروس کو سرکار میں پیش کر دوں۔ آج کل گورنمنٹ ایسی کتابوں کی تلاش میں ہے جو لڑکیوں کے نصابِ تعلیم میں داخل ہو سکیں۔ میں نے کہا: آپ کو اختیار ہے۔ یہ کہہ کر میں چلا آیا۔ صاحب نے وہ کتاب گورنمنٹ میں پیش کر دی۔ وہاں سے اِنعام ملا، یہاں شیر کے مُنہ کو خون لگ گیا، اوپر تلے کئی کتابیں گھسیٹ ڈالیں۔ جو کتاب لکھی، اُس پر انعام ملا۔ جو لکھا گیا، پسند کیا گیا۔ غرض ہم مُصنّف بھی بن گئے اور ساتھ ہی ڈپٹی کلکٹر بھی ہو گئے، مگر بھئی بات یہ ہے کہ انسان کا جتنا عُہدہ بڑھتا جاتا ہے، اُسی طرح اُس کی فرصت کا وقت بھی گھٹتا جاتا ہے، یہی مُصیبت ہم پر پڑی۔ اِدھر کام کی زیادتی، اُدھر سر سیّد کی فرمایشوں کی بھرمار، آج یہاں لکچر دیا، کل وہاں دیا، تصنیف کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا۔

خُدا خُدا کر کے بُڑھاپے میں فرصت ملی تو قرآن شریف حِفظ کر لیا۔ اُس کے ساتھ ہی یہ شوق ہوا کہ اِس کا ترجمہ بھی کر ڈالو، لوگوں کو بھی مُفید ہو گا اور شاید تمھاری نجات کا بھی ذریعہ ہو جائے۔ غرض جتنی محنت ممکن تھی، اُتنی محنت کی۔ اِسی ترجمے کے سلسلے میں اَلحُقُوق وَالفَرائِض کا مَواد بھی جمع کر لیا۔

کلام مجید کی دُعاؤں کو بھی ایک جگہ اکٹھا کر لیا۔ غرض ایک پنتھ اور کئی کاج ہو گئے۔ مگر بھئی سچ کہنا کہ کیسا ترجمہ کیا ہے؟ میں تو خاموش رہا، مگر دانی نے کہا کہ مولوی صاحب! ہم کو اِس ترجمے کے دیکھنے کا اِتّفاق نہیں ہوا۔ مولوی صاحب نے کہا: ہیں میاں دانی! یہ کیا کہا! تم نے ابھی تک میرا ترجمہ نہیں دیکھا! بھئی غضب کیا! ارے میاں رحیم بخش! ذرا اِدھر تو آنا، وہ جو سُنہری جِلد کی حمائل شریف ہے، وہ میاں دانی کو دے دو۔ بیٹا! ذرا اِس کو غور سے پڑھو، دیکھو تو میں نے اِس بُڑھاپے میں کیا محنت کی ہے۔ غرض حمائل شریف میاں دانی کے قبضے میں آگئی۔ اُنھوں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ آپ کی یادگار رہے گی۔ جب ہم اُٹھ کر چلنے لگے تو مولوی صاحب نے دانی سے کہا: ارے بھئی! ایک بات تو کہنی بھول گیا، اِس حمائل شریف کا ہدیہ ساڑھے پانچ روپے ہے، کل ضرور لیتے آنا۔ بچارے کا شکریہ اکارت گیا اور دوسرے رُوز پورے ساڑھے پانچ روپے مولوی صاحب نے دَھرا لیے۔

مولوی صاحب نے اِس عاجز پر بھی رقمی حملے کیے، لیکن یہ ذرا ٹیڑھا مقابلہ تھا۔ ایک چھوڑ کئی کتابیں مولوی صاحب سے اینٹھیں، کبھی ایک پیسا نہ دیا۔ یہ نہیں کہ خدانخواستہ وعدہ کرتا اور رقم نہ دیتا، مَیں اُس وقت تک کتاب لیتا ہی نہ تھا جب تک مولوی صاحب خود نہ فرما دیتے کہ اچھا بھئی تو یوں ہی لے جا، مگر میرا پیچھا چھوڑ۔ میری ترکیب یہ تھی کہ پہلے کتاب پر قبضہ کرتا مولوی صاحب قیمت مانگتے، میں حُجّت کرتا، وہ جواب دیتے، میں اُس کا جواب دیتا، غرض بہت کچھ جھک جھک کے بعد تھک کر کہتے کہ جاؤ میں نے قیمت مُعاف کی، آیندہ میری کسی کتاب کو ہاتھ لگایا تو اچھا نہ ہوگا، مگر خدا غریقِ رحمت کرے! ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب مجھ کو دے دیتے تھے اور جان جان کر جھگڑتے تھے۔ ریویو کے لیے جو کتابیں آتیں، وہ تو ہمارے باپ دادا کا مال تھیں وہ پورا ریویو لکھنے بھی نہ پاتے کہ کتاب کے صفحۂ اوّل پر میرا نام درج ہو کر

شہادتِ دستاویزی اور ثبوتِ قبضہ کی شکل اختیار کر لیتا۔ اِس وقت بھی میرے پاس اُس زمانے کی بعض کتابیں موجود ہیں۔ معلوم نہیں کہ میاں دانی کو جو حمائل شریف عطا ہوئی تھی، وہ اُن کے پاس رہی یا نہیں۔

کتابیں تو کتابیں، میں نے مولوی صاحب کی ایل۔ ایل۔ ڈی کی گون پر قبضہ کرنے کا فکر کیا تھا۔ ہوا یہ کہ جب میں اور دانی بی۔ اے میں پاس ہوئے تو جلسۂ تقسیمِ اسناد کے لیے لاہور جانا پڑا۔ گون بنوانا بے ضرورت سمجھا گیا۔ اب خیال ہوا کہ گون کس کی چھینیں۔ دانی کو تو گون مل گئی، میں نے مولوی صاحب کی گون تاکی۔ ہم دونوں مل کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ضرورت کا اظہار کیا۔ کہنے لگے: بیٹا! میری گون بڑی قیمتی ہے، ساڑھے چھے سو روپے میں ڈو گونیں پڑی ہیں۔ بھلا میں کیا خریدتا، یہ میاں مُشترف نے میرے سر منڈھ دیں۔ وہ ایڈمبرا میں پڑھتے تھے، مجھے لکھا کہ اپنی تمام تصنیفات و تالیفات کی نہایت عمدہ جلدیں بندھوا کر بھجوا دیجیے، سر ولیم میور دیکھنا چاہتے ہیں۔ سر ولیم میور پہلے ممالکِ مغربی و شمالی کے لفٹننٹ گورنر تھے، مجھ پر بھی بہت مہربان تھے۔ میں نے مُشترف کے لکھے کو سچ جانا، کتابوں کی جلدیں بندھوا ایڈمبرا روانہ کر دیں۔ اُن کتابوں میں میرا کلام مجید کا ترجمہ بھی تھا، وہ بہت پسند کیا گیا۔ سر ولیم میور نے یہ کتابیں ایڈمبرا یونی ورسٹی میں پیش کر دیں اور ہمیں گھر بیٹھے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ مگر اِس ڈگری کی اِطلاع میرے پاس بعد میں آئی، پہلے ایک درزی کا خط اور بل آیا کہ مسٹر مُشترف کی فرمایش کے بموجب ایل۔ ایل۔ ڈی کی ایک سیاہ اور ایک سُرخ گون مع ٹوپی کے روانہ کی گئی ہے؛ براہِ کرم جس قدر جلد ممکن ہو، ساڑھے چھے سو روپے روانہ فرمائیے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے! یا تو مشترف دیوانہ ہو گیا ہے، یا یہ درزی پاگل ہے کہ بیٹھے بٹھائے بِل روانہ کر رہا ہے۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گون کا پُلندا بھی آ گیا۔ غرض اِسی شش و پنج میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسری ڈاک سے ایل۔ ایل۔

ڈی کی ڈگری ملنے کا مُراسلہ اور میاں مُشترَف کا خط ملا۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش، درزی صاحب کو رَقم روانہ کی، مُشترَف کو بُرا بھلا کہا کہ وہاں سے یہ تھیلے بنوا کر بھجوانے کی کیا ضرورت تھی، میں یہاں اپنے ناپ کی گون بنوا لیتا۔ بہرحال یہ گونیں ساڑھے چھے سو روپے کی ہیں، معاف کیجیے میں نہیں دے سکتا۔ جا کسی پروفیسر کی گون چھین کر کیوں نہیں لے جاتا، جو میرے پیچھے پڑا ہے۔

مَیں یہ قصّہ بیٹھا سُنتا رہا۔ اُس کے بعد، بغیر کچھ کہے سُنے، اُٹھا اور مولوی صاحب کے سامان کی کوٹھری کا رُخ کِیا۔ وہ "ہاں ہاں ہاں" کہتے ہی رہے، میں نے کُنڈی کھول، اندر گھُس، الماری سے کالی گون نکال ہی لی۔ جب مولوی صاحب نے دیکھا کہ پانی سر سے گزر گیا، تو سنبھل سنبھلا کر اُٹھے۔ میں اِتنی دیر میں دروازہ بند کر، گون بغل میں مار، پھر اپنی جگہ پر آ گیا۔ مولوی صاحب بھی بیٹھ گئے اور اب اُنھوں نے گون کی قیمت، میری لاپروائی، ریل میں چوری کے خطرات، بی۔ اے اور ایم۔ ایل۔ ڈی کی گون کے اِختلاف، غرض اِسی طرح کی بیسیوں چیزوں پر لیکچر دے ڈالے۔ میں بیٹھا سُنتا رہا۔ جب وہ کہتے کہتے تھک گئے، تو میں نے لیکچر دینا شروع کِیا، اُستادوں کی محبّت، اپنی غربت، گون کی صرف ایک رُوز کی ضرورت، وقت کی قِلّت، غرض دس بارہ پہلوؤں پر میں نے بھی اِسپیچ دے دی اور آخر میں صاف صاف کہہ دیا کہ یہ گون میں لے کر جاؤں گا اور ضرور لے کر جاؤں گا۔ اِس کے بعد مولوی صاحب کچھ نرم پڑے، کہنے لگے: واپس کب کروگے؟ میں نے کہا: آپ سُرخ گون پہنتے ہیں، کالی گون مجھے دے دیجیے۔ آپ کا کچھ نقصان نہ ہوگا اور ایک غریب کا فائدہ ہو جائے گا۔ مولوی صاحب نے کہا: نہیں بیٹا! لاہور سے آکر دے دیجیو، مجھے دربار وغیرہ میں یہ گون پہننی پڑتی ہے۔ یہ الفاظ اُنھوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہے کہ مجھے بھی وعدہ کرتے ہی بن پڑی۔

آخر میں گون لے کر گیا اور لاہور سے آکر واپس کر دی۔ جب مولوی صاحب

نے گون پر قبضہ کر لیا، اُس وقت بہت خفا ہوئے، کہنے لگے: اب کے تو اگر میری کوٹھڑی میں گھُسا، تو اچھّا ہی نہ ہوگا۔ کل کو میرا کیش بکس اُٹھا کر لے جائے گا۔ خیر دانی گون لے جاتا، تو کچھ ہرج نہ تھا، کیوں کہ واپسی کی تو اُمّید رہتی۔ مجھے کب اُمّید تھی کہ آپ بُزُرگ واپس بھی کر دیں گے۔ وہ تو کہو میرا حلال کا مال تھا جو واپس آ گیا۔ میں نے کہا: مولوی صاحب! اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ آپ کو گون کی واپسی کی تَوَقُّع نہیں ہے، تو آپ اِس کی تمام عُمر شکل بھی نہ دیکھتے۔ ہنس کر کہنے لگے: چلو "مُشتے بعد از جنگ" کی صورت ہے۔ آئندہ مَیں دینے میں اِحتیاط کروں گا اور تم واپسی میں اِحتیاط کرنا۔

اُس وقت تو یہ باتیں ہنسی میں ہوئیں، مگر اب افسوس ہوتا ہے۔ گون اگر میرے پاس رہ جاتی، تو مولوی صاحب کی یادگار ہوتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ وہ گون میرے پاس بھیج دے، کیوں کہ اُس میں میرا بھی حق ہے۔ یہ ضَرور ہے کہ وہ گون مولوی صاحب نے مجھ کو دی تو نہ تھی، لیکن وہ سمجھ چکے تھے کہ یہ میرے ہاتھ سے گئی۔ میری غلطی تھی کہ جو اُس کو لے جا کر واپس کِیا۔ اب اگر مل گئی، تو کبھی ایسی غلطی نہ کروں گا۔

جس طرح مسٹر مُشَرَّف نے یہ گونیں مولوی صاحب کے گلے منڈھی تھیں، اُسی طرح نوّاب مُحسنُ المُلک نے حیدر آباد میں فرنیچر اُن کے سر چپیک دیا تھا۔ اُس زمانے میں حیدر آباد میں نوّاب مُحسنُ المُلک کا طوطی بُول رہا تھا، اُن کی تجویز اور سر سیّد کی تحریک پر مولوی صاحب حیدر آباد آئے۔ پہلے نوّاب مُحسنُ المُلک ہی کے ہاں قِیام کِیا، اُس کے بعد علاحدہ کوٹھی میں جا رہے۔ ہندستانی وضع کا سامان تخت، چوکیاں وغیرہ خرید لیں۔ بھلا مُحسنُ المُلک یہ کیوں کر دیکھ سکتے تھے کہ اُن کا دوست پُرانی وَضع کے لوگوں کی طرح زندگی بسر کرے۔ ایک رُوز سکندر آباد جا، ایلن اینڈ کمپنی کو کئی ہزار کے فرنیچر کا آرڈر دے دیا اور کہہ دیا کہ مولوی صاحب کے ہاں پہنچا دو اور بِل بنا کر بھیج دو۔

ایک رُوز جو مولوی صاحب اُٹھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ چھکڑے پر چھکڑا فرنیچر کا لدا کوٹھی کے باہر کھڑا ہے۔ بہت چکرائے، لینے سے انکار کیا، مگر وہ نوّاب محسنُ الملک کا پڑھایا ہوا شیطان تھا، وہ کب ماننے والا تھا۔ آخر لاچار گھر چھوڑ باہر آ بیٹھے اور دن بھر میں مولوی صاحب کا مکان، صاحب بہادر کی کوٹھی ہو گیا۔ مگر یہ بھی نذیر احمد تھے، کچھ ایسی چال چلے کہ جب اُن کا تقرر پٹنچرو کی صدر تعلّقے داری پر ہوا، تو وہ سب کا سب سامان، بہت ہی تھوڑی کمی پر ایلن ہی کے سر مارا اور پٹنچرو وہی اپنے پُرانے تخت وغیرہ لے گئے۔ نوّاب محسنُ الملک کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔

اب آگے کی داستان بڑی دل چسپ ہے۔ نوّاب محسنُ الملک دورے پر نکلے، پٹنچرو قیام کیا۔ مولوی صاحب خود کہیں دورے پر گئے ہوئے تھے۔ نوّاب صاحب نے گھر میں کہلا بھیجا کہ مَیں آیا ہوں، میرے قیام کا انتظام کر دو۔ ایک کمرا، جس میں دو تین کرسیاں اور ایک دو میزیں تھیں، کھول دیا گیا۔ وہ ایلن والے فرنیچر کی تلاش میں تھے، سمجھے کہ مولوی صاحب نے اپنے کمرے میں سجا کر رکھّا ہو گا، اندر کہلا بھجوایا کہ مَیں مولوی صاحب کے کمرے میں ٹھہروں گا۔ پہلے تو جواب ملا کہ وہاں آپ کو تکلیف ہو گی، مگر جب اِدھر سے اِصرار ہوا، تو وہ کمرا بھی کھول دیا گیا۔ اندر جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں صفاچٹ میدان ہے۔ نہ دری ہے نہ چادر۔ نہ چاندنی ہے، نہ میز ہے، نہ کرسی۔ کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تخت ہے، اُس پر ایک کمبل پڑا ہوا ہے۔ بازو میں ایک چوکی پر رحل اور جانماز رکھّی ہے، کھونٹی پر کلام مجید لٹک رہا ہے۔ یہ بہت چکرائے لوگوں سے پوچھا: وہ فرنیچر کہاں گیا؟ معلوم ہوا کہ آتے آتے مولوی صاحب اُس کے کوڑے کر آئے۔ بچارے ایک رات ٹھہرے اور صبح ہی کوچ بول دیا۔

کچھ عرصے تک تو نوّاب محسنُ الملک اور اُن کی بنی رہی، بعد میں اِتنی کھنچی کہ ٹوٹ گئی۔ مولوی صاحب کو یہ شکایت تھی کہ محسنُ الملک مجھ پر دباو ڈال کر

کام نکالنا چاہتے ہیں۔ محسنُ الملک کو یہ شکایت تھی کہ مولوی صاحب میرے مخالف ہو کر میرے اُکھاڑنے کی فکر میں ہیں۔ غرض جب عمادُ السلطنت بہادُر کا زمانہ آیا اور محسنُ الملک بہادر کی کمان چڑھی، تو مولوی صاحب کو میدان سے ہٹ جانا ہی مناسب معلوم ہوا۔ دوسرے، حیدر آباد میں صحبت کا جو رنگ تھا، وہ ایسا نہ تھا جس میں مولوی صاحب کا رنگ جم سکتا۔ اُس زمانے کے جو حالات مولوی صاحب بیان کیا کرتے تھے، اُن کا زبانِ قلم پر نہ آنا ہی زیادہ مناسب ہے۔

بعد میں دونوں بہ ظاہر ملتے جُلتے تھے، لیکن موقع پڑا تو ایک دوسرے کو پردے ہی پردے میں سُنائے بغیر نہ رہتے تھے۔ ایک واقعہ تو خود میری آنکھوں کے سامنے گزرا ہے۔ ۱۹۰۲ء کے دربار کے موقعے پر کانفرنس کا اجلاس دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر ہوا۔ اُس زمانے میں نواب محسنُ الملک، علی گڑھ کالج کے سکریٹری تھے۔ کانفرنس کے صدر ہز ہائی نس سر آغا خاں تھے۔ آدمیوں کی یہ کثرت تھی کہ بیٹھنے کو پنڈال میں جگہ نہ ملتی تھی۔ ہر جلسے میں کئی کئی رئیس آجاتے تھے۔ ایک پورا دن خاص مولوی صاحب کے لکچر کے لیے مُقرر رہا۔ مدّت ہوئی تھی کہ مولوی صاحب نے پبلک میں لکچر دینا چھوڑ دیا تھا۔ اُس رُوز جو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب لکچر دیں گے، خلقت ٹوٹ پڑی۔ لکچر شرُوع ہی ہوا تھا کہ لارڈ کچنر نے کہلا بھیجا کہ آج میں بھی آؤں گا۔ نوّاب محسنُ الملک نے ایسے باوقعت و ذی جاہ مہمان کے استقبال کی تیاریاں شرُوع کیں، مولوی صاحب کے لکچر میں اس گڑ بڑ سے کھنڈت پڑتی تھی۔ پنڈال کے باہر ذرا گڑ بڑ ہوئی اور نوّاب محسنُ الملک سمجھے کہ لارڈ کچنر آئے، اُٹھ کر باہر گئے اور پھر آکر بیٹھے۔ اِس طرح وہ کوئی دس پندرہ دفعہ باہر گئے اور اندر آئے مولوی صاحب بہت جزبز ہوئے، خفا بھی ہوئے، مگر اُن کی کون سُنتا تھا۔

قصّہ مختصر، آخر لارڈ کچنر آہی گئے۔ نوّاب محسنُ الملک نے سب کا تعارُف کرایا۔ مولوی صاحب نے خو اپنا تعارُف کر لیا۔ لارڈ کچنر کہنے لگے: مولوی صاحب!

ہم نے کورس میں آپ کی کتابیں پڑھی ہیں، آج آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ مولوی صاحب نے کہا: لاٹ صاحب! مجھے بھی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، اور سب سے بڑی یہ خوشی ہوئی کہ آپ کی وجہ سے ایک مُعَمّا حل ہوگیا۔ لارڈ کچنر نے کہا: وہ کیا مُعَمّا تھا؟ مولوی صاحب نے کہا کہ ہمارے ہاں قیامت کی نشانیوں میں لکھا ہے کہ اُس وقت ایسا تہلکہ ہوگا کہ حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ایسی کیا مصیبت ہوگی کہ حمل گرا دے گی، مگر آج یقین آگیا کہ جو کچھ لکھا ہے، صحیح لکھا ہے۔ جب آپ کی آمد نے بڑے بڑے پیٹ والے بُڈّھوں کے حمل گرا دیے، تو کیا تعجّب ہے کہ قیامت کی آمد، عورتوں کے حمل گرا دے۔ تمام پنڈال میں سنّاٹا ہوگیا، مگر مولوی صاحب کو جو کہنا تھا، کہہ گئے اور اس طرح اپنے دل کا بُخار نکال لیا۔ —— بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کو وقت پر ایسی سوجھتی تھی کہ باید و شاید، چناں چہ امیر حبیب اللہ خاں ہی کے دربار کا واقعہ دیکھ لو۔

امیر حبیب اللہ خاں بقر عید کے دن دہلی میں تھے، اُس روز جمعہ تھا۔ صبح کو بقر عید کی نماز عید گاہ میں پڑھی اور جمعے کی نماز جامع مسجد میں، شام کو سرکٹ ہاؤس میں دربار کیا۔ اُس دربار میں آٹھ یا نو دہلی کے ہندو امیر اور اِسی قدر مسلمان مشاہیر بلائے گئے، اُن میں ایک مولوی صاحب بھی تھے۔ سر ہنری میک موہن نے اِن لوگوں کا تعارُف امیر صاحب سے کرایا۔ جب مولوی صاحب کی باری آئی اور اُن کی تعریف سر ہنری نے کی، تو امیر صاحب نے کہا: آپ کو اِن کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں خود اِن کی تصانیف بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اور تقریباً سب کا ترجمہ بھی کرا چکا ہوں۔ دیکھنے کا اِشتیاق تھا، وہ آج پورا ہوگیا۔ اُس کے بعد باتوں ہی باتوں میں پوچھا: آپ شعر بھی کہتے ہیں؟ مولوی صاحب نے کہا: جی ہاں کہتا ہوں، لیکن آج آپ کی تعریف میں اپنا نہیں، دوسروں کا شعر سُناؤں گا، یہ کہہ کر مُتنبّی کا یہ شعر پڑھا:

عیدٌ وعیدٌ وعیدٌ مجتمعا وَجہُ الحبیبِ ویومُ العیدِ والجُمُعا

موقعے کے لحاظ سے یہ شعر ایسا برمحل ہو گیا کہ مُتنبّی کو نصیب بھی نہ ہوا ہوگا۔ واقعات اور خاص کر "حبیب" کے لفظ نے شعر میں جان ڈال دی، تمام دربار چمک اُٹھا، امیر حبیب اللہ خاں نے اُٹھ کر مولوی صاحب کو گلے سے لگا لیا اور اتنے بوسے دیے کہ مولوی صاحب گھبرا گئے۔

دوسرے رُوز جو اُنھوں نے اِس واقعے کا ذِکر ہم سے کِیا، اُس کو اُنھی کے الفاظ میں دُہرانا اچھّا معلوم ہوتا ہے، کہنے لگے: بھئی، میں تو شعر پڑھ کر مُصیبت میں پھنس گیا۔ شعر پڑھنا تھا کہ یہ معلوم ہوا کہ کسی شیر نے آکر مجھے دبوچ لیا۔ اُس میرے شیر کا کوئی سوا گز چوڑا سینہ، میں ٹھہرا چھوٹے قد کا آدمی، اُس نے جو پکڑ کر بھینچا، تو اُدھر تو ہڈّیاں پسلی ہو گئیں، اِدھر دم گھُٹنے لگا۔ اُس کی گرِفت سے نکلنے کی ہزار کوشش کرتا ہوں، جُنبش تک نہیں ہوتی۔ قسم خُدا کی، اِس وقت تک ہڈیوں میں درد ہو رہا ہے۔ بارے، خُدا خُدا کر کے گرِفت ڈھیلی ہوئی تو میں ذرا علاحدہ ہوا۔ ابھی پوری طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ اُس نے میرے گلے میں باہیں ڈال، بوسے پر بوسہ لینا شروع کِیا۔ بھلا مجھ بڈّھے کو دیکھو اور امیر صاحب کی اِس حرکت کو دیکھو! کچھ تعریف کا یہ طریقہ افغانستان ہی میں اچھّا معلوم ہوتا ہوگا۔ مجھے تو مارے شرم کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ اللہ کا بندہ ذرا دَم لیتا اور سُبحان اللہ کہہ کر پھر لپٹ جاتا۔ لپٹتا اور لپٹتے ہی بوسے پر بوسہ لینا شروع کر دیتا۔ بیچارے دوسرے بھلے آدمی بیٹھے ہوئے کیا کہتے ہوں گے۔ جب میں نے اِس مصیبت سے رہائی پائی، تو میری ناک سے پسینا اِس طرح بہہ رہا تھا جس طرح کسی ٹوٹی صُراحی میں سے پانی بہتا ہے۔ نا بھائی نا! ایسے دربار کو میرا دور ہی سے سلام ہے۔ کون شعر پڑھ کر اپنی ہڈّیاں تڑوائے۔ مولوی صاحب اپنی ہڈّیاں سہلاتے جاتے اور یہ قصّہ بیان کرتے جاتے تھے، مگر اُن کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا

کہ خوشی کے مارے دل کھلا جارہا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ شعر کی داد، اِس طرح اور اِس رنگ میں، آج تک نہ کسی شاعر کو ملی ہے اور نہ ملے گی۔

اِس تیزیِ طبع کے ساتھ صاف گوئی بھی بلا کی تھی۔ جو کہنا ہوتا، وہ کہے بغیر نہ رہتے تھے، اِس میں کسی لفٹننٹ گورنر پر ہی حملہ کیوں نہ ہو جائے۔ ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن کا ایک لکچر ہوا اور اُس میں اُنھوں نے اِس بات پر زور دیا کہ جب تک ہندستانی، یورپ والوں کی طرح سچ بولنے کی عادت نہ ڈالیں گے، اُس وقت تک ہندستان ترقی نہیں کر سکتا۔ اخباروں میں یہ لکچر پڑھ کر مولوی صاحب کو بہت غصہ آیا۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ اُس کے چند ہی روز بعد ہمارے کالج میں سالانہ جلسہ ہوا اور لارڈ لیفرائے، جو ہندستان کے لاٹ پادری تھے، تشریف لائے۔ شامتِ اعمال سے اُنھوں نے بھی اپنے لکچر کا موضوع یہی قرار دیا۔ کالج کی طرف سے لاٹ صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مولوی صاحب تجویز کیے گئے۔ اب کیا تھا، اللہ دے اور بندہ لے، جو کچھ دل میں بخار بھرا تھا، خوب اچھی طرح نکال لیا۔ کالج والے حیران تھے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے! مولوی صاحب شکریہ ادا کر رہے ہیں یا لاٹ صاحب پر اعتراضات، مگر اُنھوں نے جب تک اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نہ نکال لی، خاموش نہیں ہوئے۔

سب سے پہلے اُنھوں نے ہندستان کے مغربی اثر کو نہایت پُر مذاق پہلو سے بیان کیا، فرمانے لگے: حضرات! پیجامہ اچھا ہے یا پتلون؟ ہم پُرانے آدمی تو موسم کے لحاظ سے، اُٹھنے بیٹھنے کی سہولت و آرام کے لحاظ سے پیجامے ہی کو اچھا کہیں گے، مگر آج کل کے ہندستانی صاحب بہادر پتلون کا ساتھ دیں گے۔ یہ کیوں؟ اِس لیے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہم اچکن یا انگرکھے کو اچھا کہیں گے کہ اِس سے ستر ڈھکتا ہے، آدمی بھاری بھر کم معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے یورپ کے دل دادہ بھائی کوٹ کو پسند کریں گے۔ یہ کیوں؟ اِس

لیے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہم بڈھے سلیم شاہی جوتی پر جان دیں گے، کیوں کہ اُس میں پیر کو آرام ملتا ہے، نرم اور سبک ہوتی ہے۔ ہمارے فیشن کے عاشق فل بوٹ کا اِنتخاب کریں گے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہمارے پاس اپنی پُرانی ہر چیز کے اچھے ہونے کا ثبوت موجود ہے۔ اُن کے پاس صرف ایک جواب ہے کہ یورپ والے ایسا پہنتے ہیں۔ اور بھئی! ہے بھی یہی بات۔ قسمت نے ہم کو انگریزوں کا ماتحت کر دیا ہے؛ اُن کی ہر چیز، ہمارے لیے قابلِ تقلید ہے اور اُن کا ہر فعل، ہمارے لیے چراغِ ہدایت۔

اب افعال سے گزر کر اقوال پر نوبت آگئی ہے۔ پادری کرزن تھوڑے ہی دن ہوئے فرما چکے ہیں کہ ہندستانی سچ چھوڑو اور انگریزی سچ بولا کرو۔ آج ہمارے پادری لیفرائے بھی اُن کے ہم نوا ہوئے ہیں۔ یا تو انھوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں کے سچ اور یورپ کے سچ میں فرق ہے اور وقت آگیا ہے کہ پیجامے کی طرح ہندستانی سچ کو اُتار پھینک دیا جائے اور پتلون کی طرح ولایتی سچ پہن لیا جائے۔ یا اُن کا یہ خیال ہے کہ ہندستان کے کسی مذہب نے سچ کی تلقین ہی نہیں کی ہے اور یہ نیا مال دساور ہو کر ولایت سے آیا ہے۔ بہ ہر حال کچھ بھی ہو، اب تمھارے پُرانے سچ کی قدر نہیں رہی ہے۔ خُدا کے لیے اگر اپنا بھلا چاہتے ہو، تو اِن لاٹ صاحبوں کا حُکم مانو۔ یہ بڑے لوگ ہیں، مولوی نذیر حسین یا پنڈت بانکے لال نہیں ہیں، کہ انھوں نے ہندستانی سچ بولنے کی ہدایت کی اور تم ہنس کر ٹال گئے۔ لاٹ صاحبوں کی بات نہ مانوگے اور ولایتی سچ نہ بولوگے اور یہ تازہ مال اِستعمال نہ کروگے، تو یاد رکھّو نوکری ملنی مشکل ہو جائے گی اور نوکری نہ ملی تو روٹیوں کو مُحتاج ہو جاؤگے۔ کیوں کہ دونوں لاٹ صاحبوں نے یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ نوکری کا خبط چھوڑو اور تجارت یا صنعت و حرفت اِختیار کرو۔ اِسی سے

تمھارے دلدّر دور ہوں گے۔

آخر میں مولوی صاحب نے تھوڑا بہت لارڈ لیفرائے کا شکریہ بھی ادا کر دیا۔ لاٹ صاحب اُردو بہت اچھی جانتے تھے، مولوی صاحب کی اِس پُر مذاق تقریر پر مُسکراتے رہے، مگر دل کا خدا ہی مالک تھا۔ کالج کے مُنتظمین کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، مگر یہاں "تیر از کمان جستہ" کی صورت تھی، کیا کر سکتے تھے، البتہ دل میں اُنھوں نے ٹھان لی ہو گی کہ آیندہ مولوی صاحب کو شکریہ ادا کرنے کی تکلیف نہ دینا ہی مناسب ہو گا۔

اِس واقعے کے کچھ ہی دنوں بعد میں حیدر آباد چلا آیا۔ پھر دو دفعہ دہلی میں میرا مولوی صاحب سے ملنا ہوا۔ پہلی دفعہ جو مِلا، تو یہ وہ زمانہ تھا کہ اُمّہات الاُمّہ کی وجہ سے مولوی صاحب پر بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ میں نے اُس کا ذِکر چھیڑا۔ کہنے لگے: بھئی مجھے تو اِس کتاب میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے لوگ اِس طرح بَر انگیختہ ہو جائیں۔ تم نے بھی یہ کتاب دیکھی ہو گی، آخر تم ہی بتاؤ کہ اِس میں مَیں نے کون سی ایسی نئی بات لکھی ہے؟ میں نے خود اُمّہات الاُمّہ نہیں دیکھی تھی، مگر میں مولوی صاحب کے طرزِ تحریر سے واقف تھا، اِس لیے میں نے یہی کہا کہ مولوی صاحب آپ کا طرزِ تحریر مذاق کا پہلو لیے ہوتا ہے، وہ کچھ قصّے کہانیوں ہی میں مزا دیتا ہے۔ تاریخ کی کتابوں اور خاص کر مذہبی مُعاملات میں وہ کسی طرح کھپ نہیں سکتا۔ اگر لوگوں کو اِعتراض ہو گا تو آپ کے طرزِ تحریر ہی کے متعلّق ہو گا مولوی صاحب نے کہا: میرے کلام مجید کے ترجمے کے متعلق یہ اُدھم کیوں نہیں مچا؟ میں نے کہا: اُس پر بھی لوگوں کو اِعتراض ہیں، مگر اُس میں آپ کا مُعاملہ اللہ میاں سے ہے اور یہاں انسانوں سے، مشہور مَقولہ ہے کہ "با خدا دیوانہ باش و با محمّد ہوشیار"۔ کچھ سوچتے رہے، پھر کہنے لگے: ہاں بیٹا! کہتے تو سچ ہو، اِس قِسم کی تالیفات میرے دائرۂ تحریر سے باہر ہیں، اِنشاء اللہ دوسرے اِڈیشن

میں اِس نقص کو رَفع کر دوں گا۔

جب میں چلنے لگا تو فرمایا: کہو بیٹا! پھر ملو گے؟ ابھی تو تمھارے جانے میں بہت دن ہیں۔ میں نے کہا: اِنشاءَ اللہ ضرور آؤں گا۔ ہنس کر کہنے لگے: اِنشاءاللہ کہنے کے بعد تم ضرور آؤ گے! مسلمانوں کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو ہزاروں قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ یہ کام میں ضرور کروں گا، مگر جب کام کے کرنے کو جی نہیں چاہتا، تو ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ اِنشاءاللہ ضرور کروں گا۔ ہم تو اِس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ اِس کام کے کرنے کا تو ارادہ نہیں ہے، ہاں اگر خُدا نے چاہا اور زبردستی یہ کام کرا دیا، تو مجبوراً کر لیں گے۔ میں نے کہا: مولوی صاحب! آپ کو "انشاءاللہ" کے یہ معنی پہنانے مناسب نہیں۔ آپ مذاقیہ پہلو مذہبی معاملات میں بھی نہیں چھوڑتے۔ کہنے لگے: میاں! پہلے "اِنشاءاللہ" کے معنی دوسرے تھے، آج کل کے مسلمان وہی معنی لیتے ہیں جو میں نے بیان کیے۔ خُدا کی قدرت دیکھو کہ اُسی رات کو عَین میرے پلنگ کے نیچے طاعون کا چوہا مرا، اور صبح ہی کے مِیل سے میں ایسا دہلی سے بھاگا کہ حیدرآباد آکر دم لیا۔

دوسری دفعہ جو میں مِلا تو مولوی صاحب کی صحّت جواب دے چکی تھی۔ چھت پر جو چھوٹا کمرا تھا، اُس میں آرہے تھے۔ رَعشے میں اضافہ ہو گیا تھا، آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا تھا، پلنگ پر بیٹھے رہا کرتے تھے۔ میں نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھتے ہی بڑی زور سے سلام کیا۔ کہنے لگے: ہَیں یہ کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا: مَیں ہوں۔ پھر پوچھا: آخر "مَیں" کون صاحب ہوئے؟ نام کیوں نہیں بتاتے۔ ارے بھائی! اب مجھے صاف دکھائی نہیں دیتا، ذرا قریب آؤ۔ میں نے کہا: واہ مولوی صاحب واہ! اگر آواز سے نہیں پہچانا، تو خوب پہچانا! دور سے پہچانیے تو بات ہے۔ ایک دفعہ ہی ہنس پڑے اور کہنے لگے: اوہو، میاں فرحت ہیں! بھلا اور کون

یہ بے تُکی باتیں کرے گا۔ آؤ بیٹا آؤ ، اب کے تو کئی برس کے بعد آئے۔ میں پاس گیا ، گلے لگایا ، حالات پوچھتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے کہا: ذرا دیکھنا بھئی ، گھڑی میں کیا بجا ہے ؟ میں نے گھڑی دیکھ کر کہا کہ ساڑھے نو میں پانچ منٹ ہیں۔ کہنے لگے: اُوہو دیر ہو گئی! ذرا میرا جوتا اور جُرّابیں تو لے آؤ۔ میں نے لاکر جُرّابیں پہنائیں۔ جوتا سوکھ کر لکڑی ہو گیا تھا ، وہ زبردستی پانو میں ٹھونسا۔ جوتا پہن کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے کھونٹی پر سے اُتار کر شیروانی اور ٹوپی دی۔ وہ پہن کر کہنے لگے: چلو بھئی چلو ، وقت تنگ ہو گیا ہے۔ میں نے کہا: مولوی صاحب! آخر کہاں جانا ہے؟ کہنے لگے: بیٹا! آج ایک مقدمے کی پیشی ہے ، وہاں جا رہا ہوں ، ذرا مجھ کو کشمیری دروازے تک تو لے چل۔

میرا ہاتھ پکڑ کر نیچے اُترے۔ باہر دیکھوں تو کوئی سواری نہیں۔ میں نے کہا: مولوی صاحب! خُدا کے لیے اب اِس عمر میں تو اِس طرح پیدل نہ پھرا کیجیے! خُدا نے سب کچھ دے رکھا ہے ، آخر یہ کس دن کے لیے ہے! روپیہ اِسی لیے ہوتا ہے کہ خرچ کیا جائے۔ بال بچّوں کی طرف سے بھی بے فکری ہے۔ کیوں اِس بُڑھاپے میں آپ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ ذرا اپنی حالت کو دیکھیے اور کشمیری دروازے کو دیکھیے! یہ دو میل آنا اور جانا آپ کو مُضمحِل کر دے گا۔ ذرا ٹھہر جائیے ، میں گاڑی لے آتا ہوں۔ بہت بگڑے اور کہنے لگے: تجھ کو میرے مُعاملے میں دَخل دینے کی کیا ضرورت ہے! اب چلتا ہے تو چل ، نہیں ، میں کسی اور کو بُلاتا ہوں۔ ابھی میرے ہاتھ پانو نے ایسا جواب نہیں دیا ہے کہ کشمیری دروازے تک نہ جا سکوں۔ میں نے کہا: مولوی صاحب! خُدا کے لیے اب تو گاڑی رکھ لیجیے۔ اگر آپ خرچ نہیں اُٹھاتے ، میں اُٹھاؤں گا۔ ہنس کر کہنے لگے: کیوں نہ ہو ، روپیہ اُچھلنے لگا ہے۔ کیا میرے پاس اِتنا روپیہ نہیں ہے کہ گاڑی نہ رکھ سکوں۔ بیٹا! بات یہ ہے کہ پہلے تو میں نے اِس لیے گاڑی گھوڑا نہیں رکھا کہ سائیسوں سے ڈر لگتا تھا۔ ایک تو دانہ گھاس چُراتے ہیں ،

دوسرے گھوڑے کی مالش نہیں کرتے، تیسرے گاڑی کا آج یہ توڑا، کل وہ توڑا، کون بیٹھے بٹھائے اپنی بھلی چنگی جان کو یہ عذاب لگائے اور دن رات کا فکر مول لے۔ رفتہ رفتہ پیدل پھرنے کی عادت ہوگئی۔ اب آخری عمر میں گاڑی کی ضرورت ہوئی، تو گاڑی رکھتے ہوئے شرم آتی ہے کہ لوگ کیا کہیں گے، کہ تمام عمر تو مولوی صاحب جوتیاں چٹخاتے پھرے، اب بڑھاپے میں گاڑی پر سوار ہوکر پھرتے ہیں نا بھئی نا! اب گاڑی رکھنا وضع داری کے خلاف ہے۔ میں نے کہا: تو کمیشن ہی جاری کرالیا ہوتا۔ کہنے لگے: وہ بھی میری وضع داری کے خلاف ہے۔ ہمیشہ کچہری میں جاکر گواہی دی، اب بڑھاپے میں، اُس وضع داری کو کیوں توڑوں۔ بہرحال یہی جھجکتے کرتے کچہری پہنچ گئے۔ ڈپٹی صاحب کو اطلاع ہوئی، اُنھوں نے مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں بٹھایا اور سب سے پہلے اُنھیں کا مقدمہ لے کر، اُن کی شہادت قلم بند کی۔ اور یہ جس طرح گئے تھے، اُسی طرح ہانپتے کانپتے، میرا ہاتھ پکڑ کر گھر آگئے۔

حیدرآباد آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ اُس چہکتے ہوئے بلبل نے اِس گلشنِ دنیا سے کوچ کیا۔ جب کبھی دہلی جاتا ہوں، تو مولوی صاحب کے مکان پر ضرور جاتا ہوں۔ اندر قدم نہیں رکھتا، مگر باہر بڑی دیر تک دیوار سے لگ کر دروازے کو دیکھا کرتا ہوں اور رہ رہ کر ذوق کا یہ شعر زبان پر آتا ہے:

یہ چمن یوں ہی رہے گا، اور سارے جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

اللہ بس، باقی ہوس

فرہنگ

آبا و اَجداد : باپ دادا ["آبا" "اَب" کی جمع ہے اور اجداد "جَد" کی جمع ہے۔ مراد ہوتی ہے خاندان کے پچھلے بزرگوں سے]۔

آغاز : شروعات۔

آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں : حیران رہ گئے۔

ابتدائی : شروع کی۔

احاطۂ تحریر سے باہر ہے : بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اخراجات : خرج کی جمع۔ خرج : خرچ۔

اُخُوّت : بھائی ہونے کا رشتہ، بھائی چارا۔

اِستغنا : بے نیازی، بے توجہی۔

اَسناد : سند کی جمع۔

اِظہار : ظاہر کرنا، بیان کرنا۔

اِعراب : زیر، زبر، پیش، جزم وغیرہ۔

اَفعال : فعل کی جمع۔ یہاں مراد ہے مختلف کاموں سے۔

اَقوال : قول کی جمع۔

اِکتفا نہیں کیا : اسی پر بس نہیں کیا۔

اگر مگر : پس وپیش، ہچکچاہٹ، تذبذب۔

اَلحقوقُ وَالفرائض : مولوی نذیر احمد صاحب کی ایک کتاب کا نام۔

اَلقصہ : مختصر یہ ہے کہ۔

اللہ دے اور بندہ لے : کسی بات کی کثرت کا اظہار، یعنی کہنا جو شروع کیا تو بس بہت سی باتیں کہتے چلے گئے۔

اَمر : بات [اس امر کی کوشش کروں گا : اس بات کی کوشش کروں گا]۔

اُمّہاتُ الاُمّہ : مولوی نذیر احمد صاحب کی ایک کتاب کا نام جس میں رسول اللہؐ کی ازواجِ مُطَہّرات (یعنی بیویوں) کے حالات لکھے ہیں۔ [لفظی معنی: اُمّت کی مائیں]۔

اوصاف : ("وصف" کی جمع)۔ کمالات، ہُنر۔

اوصافِ حمیدہ : اچھائیاں، عُمدہ کمالات۔

اوقات : وقت کی جمع۔

اَہلِ کار : دفتر کا منشی، مُحرّر، کلرک۔

ایرے غیرے پچکلیان : مراد یہ ہے کہ معمولی درجے کے پڑھانے والے نہیں ہوتے تھے۔

[ایرے غیرے : وہ لوگ جن سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہ ہو۔ پچکلیان : وہ گھوڑا

جس کے گھٹنوں اور پیشانی کا رنگ ، بدن کے رنگ سے مختلف ہو ۔ مجازاً : دو غلا] ۔

ایک پنتھ ، کئی کاج : ایک تدبیر سے کئی کام نکالنا ۔

اپنچن چھوڑ گھسیٹن میں پڑے : ایک آفت تو تھی ہی ، دوسری اُس سے بڑھ کے آپڑی ۔

ایں چہ کاراست کہ کردہ : یہ آپ نے کیا کیا ہے ۔

باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار : مطلب یہ ہے کہ خدا کو جو چاہو کہہ لو ، مگر رسول اللہؐ کا جب ذکر آئے ، تو بہت سنبھل کر بات کرو ۔

بار : بوجھ

بارہ پتھر باہر کرنا : کسی شخص کو شہر کی حدود سے باہر نکال دینا ۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ قواعد کی بحث میں اُن کو شامل نہیں کیا جاتا تھا ۔

باعث : سبب

بالائے طاق رکھ دینا : الگ رکھ دینا ، مراد ہوتی ہے نظر انداز کر دینے سے ۔

بانات : ایک قسم کا اونی کپڑا ، جو بہت دبیز اور گرم ہوتا ہے ۔

باون تولے پاؤ رتی : بالکل ٹھیک ، بالکل صحیح ۔

باید و شاید : مطلب یہ ہے کہ اُن کو بر محل اور موقعے کے مناسب بات ایسی سوجھتی تھی کہ کسی دوسرے کو شاید ہی سوجھ سکے ۔

بجنسہٖ : اسی طرح ، جیسے ۔

برانگیختہ ہو جائیں : ناراض ہو جائیں ، غصہ آجائے ۔

بسورنا : رُہانسا ہونا ، رونے والے کی سی شکل بن جانا

بہ سر و چشم : سر آنکھوں پر ، یعنی خوشی سے ، بہت اچھا ۔ (اس حکم کی تعمیل نہایت خوشی سے کروں گا) ۔

بہ قولِ شخصے : کسی کا قول ہے ، جیسا کہ کہا گیا ہے ۔

بے اعتنائی : بے توجہی ۔

بیت الخلا : پاخانہ ۔

بے دریغ : بلا تامل ، ہچکچاہٹ کے بغیر ، کثرت سے ۔

بے سری فوج : ایسی فوج جس کا کوئی سردار نہ ہو ۔

بے نیلِ مرام : مقصد حاصل کیے بغیر ۔
[نیل : پانا ــ مرام : مقصد]

پرائے برتے کھیلا جوا ، آج نہ موا ، کل موا : جو دوسرے کے بھروسے پر کام کرتا ہے اُسے ایک نہ ایک دن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے ۔

پرنم : مراد ہیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھیں ۔

پژمردہ : مرجھایا ہوا ، افسردہ ، رنجیدہ ۔

پگّڑ: بہت بڑی پگڑی۔

تالیف: مختلف کتابوں کے مضامین کو نئے انداز سے ترتیب دینا۔

تالیفات: تالیف کی جمع۔

تاوان: جرمانہ۔

تاویل: ظاہری معنی سے ہٹ کر کوئی دوسرے معنی بتانا۔کسی بات کو دوسری طرح بیان کرنا۔ کسی عبارت کا دوسرے طور پر مطلب نکالنا۔

ترکیب بیان کی: قواعد کے مطابق جملے کے سب ٹکڑوں (فعل، فاعل، مفعول، متعلقات فعل وغیرہ) کو الگ الگ بیان کر کے پورے جملے کو مکمل کیا۔[اس کا تعلق نحو سے ہے]۔

ترم: بگل

تصریح: واضح طور پر بیان کرنا، صاف صاف کہنا۔

تصنیف: کتاب لکھنا، کوئی مضمون لکھنا۔

["تالیف" کا مقابل ہے۔ دیکھیے تالیف]۔

تصنیفات: تصنیف کی جمع، مراد ہے اپنی لکھی ہوئی کتابوں سے۔

تعلیم: گانے بجانے یا ناچنے کی مشق۔

تغیّر: تبدیلی

تقطیع: شعر کا وزن۔[تقطیع سے گرنے نہ دیتا تھا: شعر کو غیر موزوں نہیں ہونے دیتا تھا]۔

تکمِلہ: جس سے کوئی چیز مکمل ہو جائے۔

تکمیل: مکمل کرنا۔

تلافی: بدل، عوض۔

تِلاوت: قرآن شریف پڑھنا

تلنگے: (شروع کے زمانے میں) انگریزی فوج کے ہندستانی سپاہی، جو انگریزی وردی پہنتے تھے۔

تمہید: اصل مضمون سے پہلے، اُس کی نسبت سے کچھ کہنا۔ مضمون کی اُٹھان۔

توبہ تِلّا کی: بہت فریاد کی، رویا دھویا، بہت افسوس ظاہر کیا۔

توقُّع: امید۔

توکّل: صرف خدا پر بھروسا رکھنا۔

تیر از کمان جَستہ: کمان سے نکلا ہوا تیر۔ مراد یہ ہے کہ جو بات مُنہ سے نکل گئی، اس تیر کی طرح ہے جو کمان سے نکل گیا ہے کہ اب وہ واپس نہیں آسکتا۔

ٹانگ لینا: پیچھے پڑ جانا، سر ہو جانا۔

ٹٹوانی: ٹٹو کی مادہ، چھوٹے قد کی گھوڑی۔

ٹھوٹھ: بے وقوف، مورکھ، کوڑھ مغز۔

ٹِیں نہ ہو جائیں: مر نہ جائیں۔

جانب: طرف۔ (دونوں جانب: دونوں طرف)۔

جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے: مطلب یہ ہے کہ سب کچھ کہنے اور سُننے کے لیے تیار تھے۔ [زندگی سے ہاتھ دھونا: زندگی سے مایوس ہو جانا۔ مرنے مارنے پر

آمادہ ہو جانا]۔

جُبّہ : کرتے کی طرح کا ایک خاص قسم کا لباس، جسے خاص کر علما اور صوفی حضرات پہنا کرتے ہیں۔

جُراب : موزے۔

جِز بِز ہوئے : آزردہ ہوئے، بُرا مانا۔

جُزوِ ایمان : ایمان کا حصہ۔ ایمان میں شامل۔

جُزوِ لاینفک : کبھی الگ نہ ہونے والا حصہ۔

جلسۂ تقسیمِ اسناد : وہ جلسہ جس میں طالب علموں کو ڈگریاں دی جائیں۔ کانووکیشن۔

جَمِ غَفیر : بہت سے لوگ، بڑا مجمع۔

جُون بدلنا : صورت بدلنا، حالت بدلنا۔

چاندنی : سفید چادر جو فرشی دری کے اوپر بچھاتے ہیں۔

چھدری داڑھی : بھری ہوئی داڑھی کے برخلاف ایسی داڑھی جس میں بال کم ہوں اور الگ الگ ہوں۔

چَپیک دینا : سر منڈھ دینا۔

چپیک دیا : مراد یہ ہے کہ وہ فرنیچر اُن کی مرضی کے بغیر اُن کے یہاں پہنچوا دیا۔

چھبڑی : ٹوکری۔

چھپّر پھاڑ کر دینا : اُس جگہ سے کچھ ملنا جہاں سے ملنے کی امید نہ ہو۔ کسی وسیلے کے بغیر رزق کا پہنچنا۔

چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں : بہت حیران و پریشان تھے۔

حدِ تجاوُز سے بڑھ جائے گی : مطلب یہ ہے کہ اندازِ بیان میں بعض جگہ وہ سنجیدگی باقی نہیں رہے گی، جو عام طور پر رہنا چاہیے۔ اندازِ بیان شوخ ہو جائے گا۔

حکمِ قضا شِیَم : ایسا حکم جو موت کی طرح ٹل نہیں سکتا، جس کی تعمیل لازم ہے۔

حُکمِ مُحکم : قطعی حکم، جس کو ماننا ضروری ہے۔

حَماسہ : عربی شاعری کا نہایت مشہور انتخابی مجموعہ۔

حَمائل : چھوٹی تقطیع کا قرآنِ پاک (جسے گلے میں ڈال سکیں)۔

حِنا : منہدی۔ [حنا کیا کرتے ہیں: قرآن پاک کے صفحات کو زردی لیے ہوئے سرخ رنگ سے رنگا کرتے ہیں]۔

حوالۂ قلم کرنا : لکھنا۔

خاتمہ بالخیر ہوگیا : (وہ دُوربین) ٹوٹ پھوٹ کر تباہ ہوگئی۔

خارج از بحث ہوگئے : گفتگو میں شامل نہیں رہے۔

خاک از تودۂ کلاں بردار : مقصد حاصل

کرنے کے لیے اونچی اور بڑی جگہ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ [لفظی معنی: بڑے ٹیلے سے مٹی اٹھاؤ]۔

خامہ : قلم۔

خصائل : خصلتیں۔

خطائے بزرگاں گرفتن، خطاست : بزرگوں کی غلطیاں نکالنا، خود غلط کام ہے۔

خم ٹھونکنا : کسی کام میں کسی سے مقابلہ کرنا۔ [کُشتی کی اصطلاح ہے۔ اِس کے اصلی معنی ہیں: کشتی کے وقت بازوؤں پر اِس طرح ہاتھ مارنا کہ زور دار آواز نکلے]۔

خم ٹھونک کر : اُس مقابلے میں شامل ہونے کی ہمت کر کے۔

خوش خوراک : اچھا اور عُمدہ کھانا کھانے والا۔

خون پانی ایک کر دیا : خون کو پانی کی طرح بہایا، یعنی بہت محنت کی۔

دال گلنی : کامیابی ہونا۔

دال گلتی معلوم نہیں ہوتی : کامیابی ہوتی نظر نہیں آئی۔

درجۂ ابتدائی میں : (بی۔ اے کے) پہلے سال میں۔

دریا بُرد ہو گیا : دریا میں بہ گیا، یعنی گُم ہو گیا۔

دست و بازو کے بھروسے پر : اپنی محنت اور ذاتی کوشش کے بل بوتے پر۔

دقیانوسی : بہت پُرانے انداز کا۔

دل دادہ : محبّت کرنے والا، عاشق۔

دل شکنی ہو گی : دل ٹوٹ جائے گا۔

دنیا کی نظریں پڑنے لگتی ہیں : شہرت حاصل ہو جاتی ہے۔

دو دو ہاتھ ہو جانا : لڑائی ہو جانا۔ مراد یہ ہے کہ کھل کر صاف صاف باتیں ہو جائیں گی۔

دہانہ : مُنہ۔

دُھسّا : موٹی اونی چادر۔

دھینگا مُشتی : ہاتھا پائی۔

ڈھئی دینا : جم کر بیٹھ جانا۔

ڈیرے ڈال دیے : جم کر بیٹھ گئے۔

رِحل : لکڑی کی بنی ہوئی وہ چیز، جس پر قرآن پاک رکھ کر پڑھتے ہیں۔

رَزمیہ قصیدہ : ایسا قصیدہ جس میں لڑائی کی تفصیلات کا بیان ہو۔ [رَزم: جنگ]۔

رقّت آمیز لہجے میں : اِس انداز سے کہ سُن کر دوسرے کو ترس آجائے، رحم آجائے۔ [رقّت: رحم، ترس، ہمدردی، نرمی]۔

روپیہ اُچھلنے لگا ہے : ایسے موقعے پر کہتے ہیں جب کوئی شخص جا و بے جا روپیہ خرچ کرے۔

رُوکھا: پھیکا، بے رس، نرمی اور ملائمت سے خالی۔

رِیش: داڑھی۔

زبان یاری نہ دیتی تھی: زبان ساتھ نہ دیتی تھی، بولا نہیں جاتا تھا۔

سایہ اَفگن: سایہ ڈالے ہوئے، یعنی آنکھوں پر جھکی رہتی تھیں۔

سبک تر: بہت ہلکا۔

سَتر ڈَھکتا ہے: بدن کے جن مقامات کو چھپانا چاہیے، وہ چھپ جاتے ہیں۔

سَراسَری: ایک زیور جسے عورتیں پیشانی پر پہنتی ہیں۔

سرِشتے دار: میر منشی، دفتر کا انچارج۔

سرمایۂ ناز تھی: کالج کی سب سے بڑی دولت تھی، کالج کو اُس پر ناز تھا۔

سر مغزی کرتے رہے: بہت توجہ اور بہت غور و فکر کے ساتھ پڑھاتے رہے۔

سُرمگیں: سُرمہ لگی ہوئی۔

سَلَف: پہلے کے لوگ، گذشتہ زمانے والے۔ خاندان کے پچھلے بزرگ (آبا و اجداد)

سُلفہ: پینے کا تمباکو، جس کو بھر بھرا کر کے چلم میں رکھتے ہیں۔

سنگ آمد و سخت آمد: بڑی مصیبت پڑی [لفظی معنی: پتھر بھی گرا تو اِتنا بھاری کہ اُٹھائے نہ اٹھے]۔

سوءِ اَدَبی: بے ادبی۔

شالی رومال: شال کا بنا ہوا رومال۔ [شال: اونی یا ریشمی چادر]۔

شامتِ اعمال سے: مراد ہے بد قسمتی سے۔ [شامتِ اعمال: کیے کی سزا، گناہوں کی سزا]۔

شانہ: کندھا۔

شبدیز: سیاہ رنگ کا گھوڑا۔

شش و پنج: فکر، اندیشہ، گھبراہٹ، حیرانی۔ [شش: چھے۔ پنج: پانچ]۔

شغاد: رستم کے بھائی کا نام، جس نے دھوکے سے رستم کو ایک کنویں میں گرا دیا تھا۔

شگفتہ الفاظ میں: ایسے لفظوں میں جنھیں سُن کر آدمی فرحت محسوس کرے، خوش ہو جائے [شگفتہ: کھلا ہوا، خوش]۔

شمسُ العلماء: ایک خطاب تھا جو انگریزوں کے زمانے میں بڑے عالموں کو دیا جاتا تھا۔ [شمس: سورج۔ عُلَماء: عالم کی جمع]۔

شَملہ: پگڑی، صافہ۔

شَملہ بہ مقدارِ علم: جتنا علم اُتنی ہی بڑی پگڑی۔

شوخ چشمی: شرارت، گستاخی۔

شیر کے مُنہ کو خون لگ گیا: مطلب یہ ہے کہ

ایک کتاب پر جو انعام ملا تو اور کتابیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

صرف و نحو: عربی کی قواعد

[صرف: جس میں لفظ کی کیفیت سے بحث کی جاتی ہے

نحو: جس میں جملے کی ترکیب سے بحث کی جاتی ہے]

صَلا کرتے: کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دیتے۔

طبع نہ کرائیں: چھپوائیں نہیں۔

طَرح دینا: نظرانداز کرنا، اعتراض نہ کرنا۔

طمانیت: اطمینان۔ [یہاں مراد ہے بغیر سوچے سمجھے، بغیر دیکھے بھالے]

طوطی بول رہا تھا: اُن کا حکم چل رہا تھا، بہت اثر تھا، دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

طول کھینچا: مطلب یہ ہے کہ ہم سب دیر تک خاموش رہے۔

عدم موجودگی: موجود نہ ہونا۔

عرضِ مدّعا زبان پر لائے: مقصد بیان کیا۔

عمامہ: صافہ۔

غریب: مسکین، بے زبان، سیدھا سادھا۔

غریق: ڈوبا ہوا۔

غریقِ رحمت کرے: اپنی رحمت نازل کرے [لفظی معنی: اپنی رحمت میں ڈبو دے]

غُلّق: گولک۔

فرَاشی سلام کیا: نہایت ادب اور تعظیم کے ساتھ بہت جھک کر سلام کیا۔

فرشی: حقّے کا نیچے کا حصّہ، جس میں پانی رہتا ہے۔

فَرہنگ: لُغت

قارِئین: پڑھنے والے۔

قارئینِ کرام: مُعزّز پڑھنے والے۔

قاموس: عربی کا نہایت مشہور لُغت۔

قبالہ: مکان یا جاگیر وغیرہ کا وہ کاغذ جس سے مالک ہونا ثابت ہو۔

قصّہ طلب: ایسا شعر جس کا مطلب سمجھنے کے لیے کسی ایسے قصّے یا واقعے کا معلوم ہونا ضروری ہو جو اُس شعر سے متعلّق ہو۔

قُطّاعُ الطّریق: راہ زن۔ راستے میں لوٹ لینے والے۔

قطعہ: ٹکڑا، حصّہ۔

قلم بند کی: لکھ لی۔

قلیہ ہوگیا: میں دب کر پس گیا، لوگوں کے دھکم دھکّا میں بُری طرح دب گیا۔

قہرِ درویش بر جانِ درویش: یہ مَثَل ہے۔ غریب آدمی غصّہ کرے گا، تو کسی کا کیا کرے

گا، اپنی ہی جان کھوئے گا۔ جب کسی مصیبت کو برداشت کرنا پڑے، اُس مقام پر یہ کہتے ہیں۔

کالنّقشِ فی الحجَر: جیسے پتھر کا نقش۔ پتھر پر کھُدی ہوئی عبارت۔

کانڑا: کانا۔

کِرام: بُزرگ، باعزّت ("کریم" کی جمع)

کردی: روزانہ آمد، خرچ اور باقی لکھنے کا بہی کھاتا۔

قُرعہ دوسرے صاحب پر پڑا: مطلب یہ ہے کہ مولوی ضیاء الدین خاں کے نام پر اتّفاق ہوگیا۔ [قُرعہ: پانسا، جسے پھینک کر جاننے والے، غیب کی، یعنی چھپی ہوئی باتیں بتاتے ہیں]۔

کلّا جبڑا: کلّا: رُخسار، گال۔ جبڑا: گال کے اندر کا حصّہ۔

کلمۂ خیر کہنا: تعریف کرنا، سفارش کرنا۔ [کلمہ: لفظ، بات]۔

کما حقّہٗ: جیسا اُس کا حق ہے، یعنی جس طرح بیان کرنا چاہیے، ٹھیک ٹھیک، پورا پورا۔

کمان چڑھی ہوئی تھی: بہت اثر تھا، چھائے ہوئے تھے، دور دورہ تھا۔

کنٹھا: ہار۔

کُندۂ ناتراش: گنوار، بے تمیز، جاہل۔

کھُک: مفلس، جس کے پاس کچھ نہ ہو، کھوکھلا، خالی۔

کھُک کر دیا: مراد یہ ہے کہ ساری دولت چھین لی، مفلس بنا دیا۔

کھکھیڑ: سخت تکلیف، محنت، مشقّت۔

کوڑے کر آئے: مطلب یہ ہے کہ پورا فرنیچر مناسب قیمت پر بیچ آئے۔ [کوڑے کرنا: دام کھڑے کرنا، قیمت اُٹھانا، بیچنا]۔

گَندھی: عطر بیچنے والا۔

گھُنگنیاں: اُبلے ہوئے چنے، جُوار، گیہوں وغیرہ۔

مُنہ میں گھُنگنیاں بھر کر بیٹھنا: چُپ رہنا، خاموشی اختیار کرنا۔

لَسّان: بہت بولنے والا، خوش گفتار، یعنی بہت اچھی طرح بولنے والا، چرب زبان۔

مار دھاڑی: بہت مصیبت اور مجبوری کے عالم میں۔

مانعِ ترقّی: ترقّی کو روکنے والی۔ ترقّی کی راہ میں رُکاوٹ۔

مُترادِف: ہم معنی۔ (ایسے دو لفظ جن کے معنی ایک ہوں)۔

متفرّق پرچوں پر: الگ الگ کاغذ کے ٹکڑوں پر۔

متفرق قرضے تھے : مختلف لوگوں کے قرض تھے۔

مُتَنَبّی : عربی کا بہت مشہور شاعر۔

محاصرہ : چاروں طرف سے گھیر لینا۔

محتسب را درونِ خانہ چہ کار : محتسب کا گھر کے اندر کیا کام۔

[محتسب: جو باتیں شریعت کے خلاف ہوں، اُن کی ممانعت کرنے والا، حاکمِ شرع]۔

مَحْو تھا: کھویا ہوا تھا۔

تماشے میں محو تھا: اِس طرح دیکھ رہا تھا کہ اور ہر چیز کو بھول گیا تھا، اُسی میں کھو گیا تھا۔

مَحْو ہونا: ذہن سے نکل جانا، بھولنا۔

مَحْو ہو جائیں: مٹ جائیں، ختم ہو جائیں۔

[دلوں سے محو ہو جائیں: لوگ بھول جائیں]۔

مَحْو ہو چکی تھی : مٹ چکی تھی، لوگ بھول چکے تھے۔

مُحیط : پھیلاو۔

مَدّ ظِلّہٗ العالی : خدا اُس کا سایہ دراز کرے، یعنی وہ بہت دنوں تک زندہ رہے۔ کلمۂ تعظیم ہے، جو بزرگوں کے لیے لکھتے ہیں۔

مَدِّ نَظَر : وہ چیز جو نگاہ کے سامنے ہو۔

[سہولت کے مدِّ نظر: سہولت کو دیکھتے ہوئے۔ سہولت کی خاطر]۔

مِرآۃ العروس : مولوی نذیر احمد صاحب کی مشہور کتاب کا نام۔

[مرآۃ : آئینہ ۔ عَرُوس : دُلھن]۔

مُراسلہ : خط۔

مرتا کیا نہ کرتا : جس کی جان پر آ بنتی ہے، وہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجبوری میں سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

مُسْمُسے : دیکھنے میں سیدھے سادھے مسکین صورت۔

مَشاغِل : شغل، کام۔

مَشاہیر: نامور اور مشہور لوگ۔

مُشتے بعد از جنگ : موقع نکل جانے کے بعد پچھتانا۔

مُضْمَحِل : نڈھال، اُداس، سُست۔

مطالعہ کرنا : کسی کتاب یا تحریر کو غور سے پڑھنا۔ اُستاد سے سبق پڑھنے سے پہلے اُس سبق کے معنی مطلب پر غور کرنا۔

معرضِ بحث میں آتے ہیں : بیان کیے جاتے ہیں۔

معلّقات : عربی کے قصیدوں کا نہایت مشہور

مجموعہ جس میں سات شاعروں کے سات قصیدے شامل ہیں۔

مَفقُود : غائب، کھویا ہوا۔

[مفقود کی سرحد میں آگئی ہے : ختم ہو چکی ہے]۔

مُقابِل : سامنے۔

مَقاماتِ حَرِیری : عربی ادب کی نہایت مشہور کتاب جو ایک زمانے میں عربی مدرسوں میں پڑھائی جاتی تھی۔

مُقطَّع : بہت سنجیدہ، بہت متین۔

مقولوں : مقولہ کی جمع۔ مقولہ : قول، بات۔

مُقَیَّش : چاندی یا سونے کے تار۔ سونے چاندی کے تاروں سے بُنا ہوا کپڑا۔

مُمالکِ مغربی وشمالی : وہ صوبہ جسے اب "اتر پردیش" کہتے ہیں۔

مُمتَحَن : امتحان لینے والا۔

منّت کش : احسان اُٹھانے والا۔

[قینچی کے منت کش نہیں ہوئے : قینچی سے کاٹنے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی]۔

مَوانِعات : رُکاوٹ پیدا کرنے والی چیزیں، روکنے والی۔

میزان : ترازو۔

ناخلَف : نالائق۔

ناطِقہ : گویائی کی طاقت، بات چیت کا ملکہ۔

ناطِقہ بند کر دیتے تھے : اپنی زور دار باتوں سے دوسروں کو خاموش کر دیا کرتے تھے۔

نَری : بکری یا بھیڑ کا رنگا ہوا چمڑا۔

نشست : بیٹھنے کی جگہ۔

نَصب تھی : لگی ہوئی تھی۔

نظامِ اَوقات : ٹائم ٹیبل۔ مختلف کام کرنے کے وقت مقرر کرنا۔

نَعوذ بِاللہ : خدا کی پناہ، خدا بچائے۔ (اظہار نفرت کے لیے)۔

نَفَر : اَدنا درجے کا ملازم۔

نَقُص : کمی، خرابی۔

نِکات : نکتہ کی جمع، باریکیاں۔

نمودار : ظاہر۔

نیم بِرِشت : آدھا بُھنا ہوا، آدھا پکا آدھا کچا۔

[نیم برشت انڈا : ہاف فرائی انڈا]۔

وَر آسکتا ہے : جیت سکتا ہے۔

وَجاہَت : عزت اور بڑائی۔

خاندانی وَجاہَت : وہ عزت اور بڑائی جو کسی شخص کو اُس کے اعلا خاندان سے ہونے کی بنا پر ملی ہو۔

ہم نَوا : ہم آواز۔ مراد ہے بات کی تائید کرنے والے سے۔

یادگارِ سَلَف : پُرانے بزرگوں (پچھلے بزرگوں) کی یادگار